آدمی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

دسمبر 2020

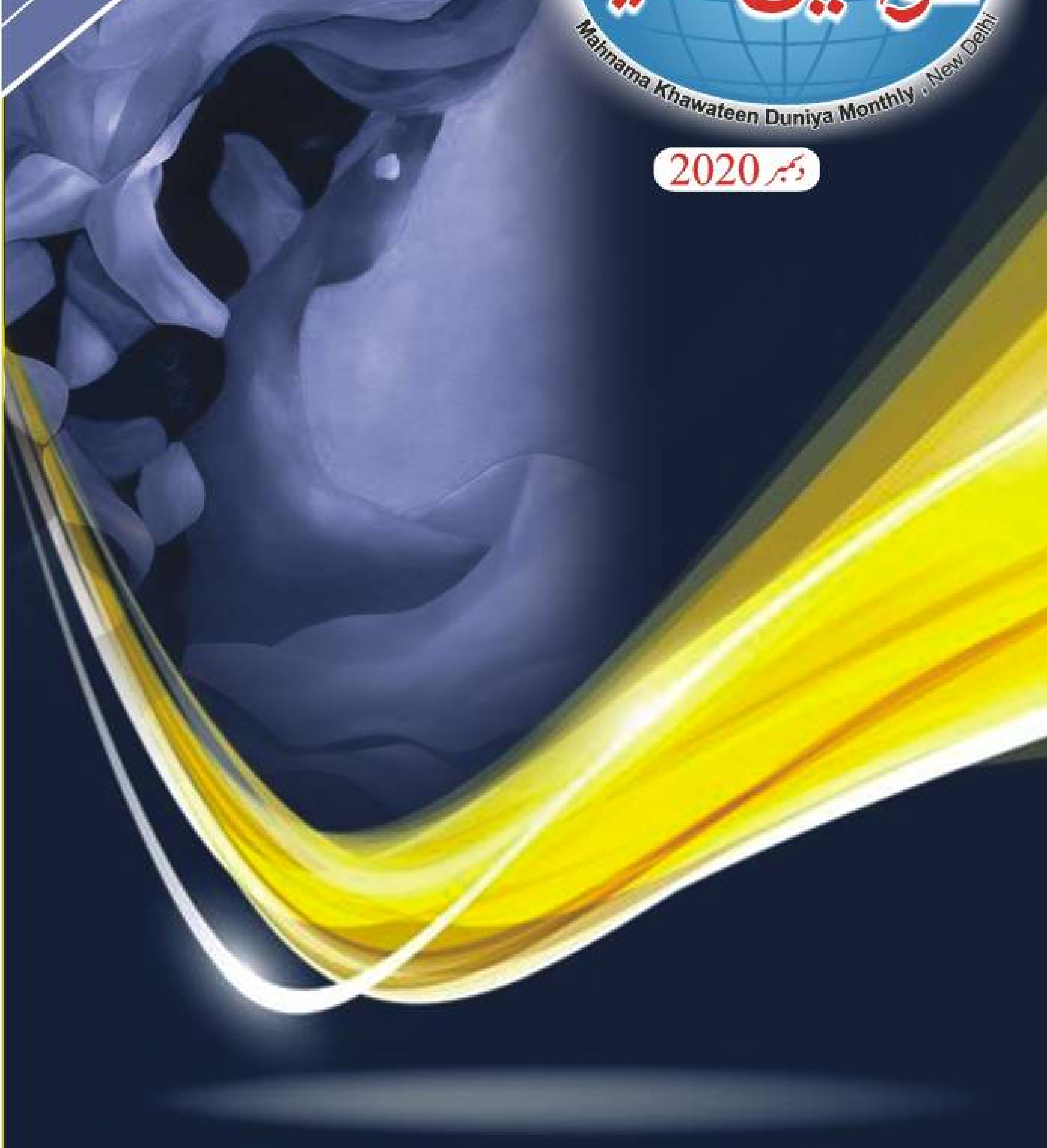

www.urducouncil.nic.in

قیمت: ₹10/-

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

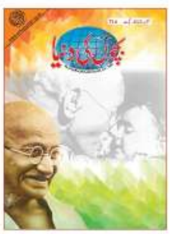

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

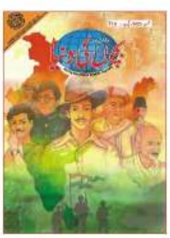

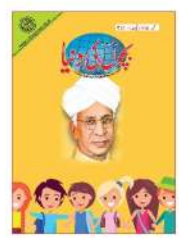

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:10 روپے　　سالانہ:100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:24415194 - 040

اس شمارے میں

اداریہ	مشعل	مدیر	4
روبرو	رخسانہ نازنین سے انٹرویو	حقانی القاسمی	5
شخصیت	مسلم نشاۃ ثانیہ کی عظیم رہنما: بی اماں	عبدالسمیع	12
نکہت سخن	شاعرات کے منتخب اشعار		19
جہان نسواں	ہمعصر معاشرہ اور عصمت چغتائی کا نقطۂ نظر	ڈاکٹر شبنم آرا	20
	اردو غزل کی نسائی آوازیں	ڈاکٹر نغمہ پروین	24
	مغرب میں اردو افسانے کا آغاز	ڈاکٹر تسنیم فاطمہ	28
	خواتین کی خود نوشتوں میں تقسیم ملک اور فسادات کا منظر نامہ	محمد شفیق	32
	رام پور کی خواتین فکشن نگار: ایک جائزہ	شاذیہ زریں	37
کہانیاں	کچے رنگوں کی محبت	ناہید طاہر	42
	کہاں تم چلے گئے	روبینہ ساگر روبی	47
حسن سخن	نازیہ ناز، آبگینہ عارف		51
باورچی خانہ	لذیذ پکوان		53
صحت	اسباب مرض	مشکور احمد	55
آرائش وزیبائش	حسن کی نگہداشت		59
تاثرات	تاثرات نگر نگر سے		61
خواتین خبرنامہ			62

آدھی آبادی کے جذبات واحساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 4 شمارہ: 12 دسمبر 2020

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

مشیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا فیز-II، نئی دہلی۔ 110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL) اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL، New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 49539000

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

سماج، سیاست، ثقافت کی سطح پر بہت سی تبدیلیاں رونما ہو چکی ہیں۔ بدلتے عہد کے ساتھ کچھ مثبت اور کچھ منفی تغیرات بھی سامنے آئے ہیں اور تبدیلیوں کا یہ عمل بیشتر محاذ پر جاری ہے۔ عہد بدلتا ہے تو بہت سے مسائل، موضوعات اور مباحث بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اکیسویں صدی کے مسائل اور موضوعات میں بھی بہت حد تک تبدیلی آئی ہے کیونکہ سائنسی ترقیات نے ہمارے انداز فکر اور طرز احساس کو بھی بہت حد تک بدلا ہے۔ ڈیجیٹل ایج میں بہت سی تصویریں بدلی ہیں، بہت سے منظر بھی بدلے ہیں۔ مگر المیہ یہ ہے کہ ٹیکنالوجی نے سماج کے ایک بڑے طبقے کی زندگی، طرز معاشرت اور معیار زندگی کو تو بدلا ہے۔ لیکن اب بھی ایک طبقہ ایسا ہے جس کی تصویر اور تقدیر تمام تر کوششوں کے باوجود تبدیل نہیں ہوئی ہے اور وہ ہے طبقۂ نسواں۔

اکیسویں صدی کے ترقی یافتہ عہد میں بھی عورتوں کے وہی مسائل ہیں جن سے وہ شروع کے زمانے سے ہی جوجھ رہی ہیں۔ آج بھی عورتوں کے ساتھ صنفی امتیاز کا معاملہ ہے چاہے تعلیم ہو چاہے روزگار ان کے ساتھ تفریق کا عمل رکا نہیں ہے۔ زیادہ تر عورتوں کو نہ تو مساوات حاصل ہے اور نہ ہی مردوں کی طرح مواقع۔ تعلیم جو ترقی کی کلید کہلاتی ہے اس میں بھی خواتین ہنوز پیچھے ہیں۔ خاص طور پر سائنس، ٹیکنالوجی، انجینئرنگ، میڈیکل اور دوسرے شعبہ جات میں ان کی نمائندگی کم ہیں۔ اس کے علاوہ قتل جنین، آنر کلنگ، خانگی تشدد اور دیگر مسائل ہیں جن سے خواتین دوچار ہیں جبکہ یہ وہ مسائل ہیں جن پر بہت پہلے سے ہی دونوں طبقے کے افراد غور و فکر کرتے رہے ہیں اور انھیں حل کرنے کی بھی کوششیں ہوتی رہی ہیں۔

کہا تو یہی جاتا ہے کہ نئے عہد میں بہت حد تک عورتوں کا امپاورمنٹ ہوا ہے اور بہت سی سطحوں پر انھیں خودمختاری اور آزادی بھی حاصل ہوئی ہے مگر زمینی حقیقت یہی ہے کہ ابھی بھی خواتین کی زندگی کے ساتھ وہی مسئلے جڑے ہوئے ہیں جو ماضی میں تھے۔ خواتین کا ایک بڑا حصہ بنیادی حقوق اور مساوات سے ابھی تک محروم ہے۔ اسی لیے آج بہت سی خواتین اپنے حقوق کے لیے آواز بھی بلند کر رہی ہیں اور پدرسری نظام کے خلاف ان کا احتجاج جاری ہے اور یہ احتجاج کبھی شاعری تو کبھی افسانہ اور کبھی مضمون کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اگر طبقۂ نسواں کے ساتھ سب کچھ صحیح ہوتا تو مزاحمت اور بغاوت کی یہ آوازیں بلند نہیں ہوتی۔

حقیقت یہی ہے کہ بہت سی عورتیں آج بھی قفس میں قید ہیں۔ ان کی کائنات گھر کی چہاردیواری ہے اور ان کے ساتھ مرد اساس معاشرہ اب بھی جبر و استحصال کا سلسلہ قائم کیے ہوئے ہے۔ ہمارے معاشرے میں جس طرح کے واقعات رونما ہو رہے ہیں وہ اس کا ثبوت ہیں۔ آج ضرورت ہے کہ صرف طبقۂ نسواں کو ہی ان مسائل کے تئیں بیدار نہ کیا جائے بلکہ اس کے ساتھ مردوں کے طرز فکر کو بھی تبدیل کیے جانے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ عورتوں کے تئیں اگر مرد معاشرہ حساس نہیں ہوگا تو پھر عورتوں کی حالت میں تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

حقانی القاسمی

رخسانہ نازنین سے انٹرویو

ٹیکنالوجی نے ملک، معاشرہ، افراد اور اماکن کی تصویر و تقدیر بدلی ہے۔ بہت سی سطحوں پر ڈیجیٹل ایج میں اس نوع کی تبدیلیاں آئی ہیں جن کا ماقبل میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ٹیکنالوجی سبھی معاشرے کے لیے امپاورمنٹ کا آلہ ثابت ہوئی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ڈیجیٹل ایج میں ٹیکنالوجی کی وجہ سے آدھی آبادی کی تصویر بھی بدلی ہے یا نہیں۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو یقینی طور پر ٹیکنالوجی نے عورتوں کے معیار زندگی کو بہتر بنایا ہے اور بہت سی سطحوں پر انھیں سہولیات بھی میسر ہیں مگر طبقۂ نسواں کا ایک بڑا حصہ ٹیکنالوجی کے فیوض و برکات سے ہنوز محروم ہے کیونکہ انٹرنیٹ یا موبائل سے بہت سی خواتین کی اتنی کنیکٹیویٹی نہیں ہے۔ قصبات اور گاؤں کی عورتیں بھی انٹرنیٹ سے اس طرح براہ راست فائدہ نہیں اٹھا پا رہی ہیں۔ جس طرح شہری علاقوں کی خواتین فیضیاب ہو رہی ہیں۔ ٹیکنالوجی نے جو مواقع اور امکانات ان کے لیے پیدا کیے ہیں ان سے بے خبر ہیں۔

آج بھی خواتین کو زمانی مکانی، سماجی، معاشی چیلنجز کا سامنا ہے۔ آج بھی عورتوں کی حیثیت حاشیائی ہے۔ انھیں مساوی حقوق و مواقع میسر نہیں ہیں۔ ان کی راہ میں ابھی بھی بہت سے موانع ہیں۔ محدود تعلیمی مواقع، کمزور طبی سہولیات، عورتوں کی پسماندگی، صنفی تفریق، خانگی تشدد، جنسی ہراسانی، آنر کلنگ، قتل جنین اور اس کے علاوہ مصنوعی حد بندیاں ـــــ معاشرے کی متصادم اور متناقض صورت حال سے ابھی بھی خواتین دو چار ہیں۔ تصور میں تو خواتین دیویاں ہیں مگر حقیقت میں دیو داسیاں۔ ٹیکنالوجی کے باوجود بہت سی عورتوں کی صورت حال میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی ہے حتیٰ کہ فیمینزم کی شدت پسندی بھی ان کی تصویر و تقدیر نہیں بدل پائی۔

رخسانہ نازنین نے اپنے اس انٹرویو میں خواتین کی صورت حال کے حوالے سے بہت سے اہم نکات پر گفتگو کی ہے۔ ان کی گفتگو میں بہت سے قیمتی اشارے ہیں جن پر توجہ دیے جانے کی ضرورت ہے۔ خود اپنے حوالے سے انھوں نے جو باتیں لکھی ہیں وہ بھی قابل غور و فکر ہیں۔ کیونکہ وہ اس درد سے گزر رہی ہیں جس سے دنیا کے بیشتر معذورین گزرتے رہے ہیں۔ رخسانہ نازنین بچپن میں ہی پولیو سے متاثر ہوگئی تھیں اور اسی درد کے ساتھ آج اپنی زندگی کے لمحے گزار رہی ہیں۔ انھیں احساس ہے کہ معذوری کی وجہ سے معاشرے نے تضحیک و تمسخر/نشانہ بھی بنایا ہے۔ مگر ان کے اندر عزم و حوصلہ ہے۔ اسی لیے وہ اپنی تحریروں کے ذریعے پوری دنیا سے اپنا رشتہ جوڑے ہوئے ہیں۔ انھیں پتہ ہے کہ معذوریت عظمت کی راہ میں حائل نہیں ہوتی اور نہ ہی کامرانی کی تاریخ لکھنے سے روک سکتی ہے۔ ان کے سامنے ان خواتین کی مثالیں ہیں جنھوں نے معذوری کے باوجود تاریخ میں اپنے روشن نقوش درج کیے ہیں اور اپنی تحریروں کے ذریعے معاشرے کو ایک نئی راہ اور روشنی دکھائی ہے۔ One Little Finger والی مالنی چھب ہو یا The Incredible Story کی نسیمہ، The Other Senses کی مصنفہ پریتی مونگا ہو یا No Looking Back کی شیوانی گپتا ہو یا River of Time کی رائٹر جیجا گھوش یا As the

Soul Flies کی یاسمین ساہنی یا The story of My Life کی ہیلن کیلر ہوں ان کے علاوہ جان ملٹن، لارڈ بائرن، ہینس اینڈرسن کرسٹی براؤن، اسٹیفن ہاکنگ وغیرہ جیسی عظیم شخصیتیں ہیں جنھوں نے Disablity لٹریچر میں گراں قدر اضافے کیے ہیں۔ سائنس، تاریخ، شاعری، فکشن اور مصوری میں اپنی تخلیقی قوتوں کا مظاہرہ کیا ہے اور معاشرتی رویوں پر سوال بھی اٹھائے ہیں۔ خود جس زبان سے رخسانہ کا تعلق ہے اس میں کئی اہم شخصیتیں ہیں جنھوں نے معذوری کے باوجود ادب میں اپنے دستخط ثبت کیے ہیں۔ رضاء الجبار بھی پولیو زدہ تھے مگر انھوں نے اعلیٰ ڈگریاں حاصل کیں۔ ایم کام کیا، ایل۔ ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ چارٹرڈ اکاؤنٹنسی سے جڑے رہے اور دنیائے ادب کو کئی افسانوی مجموعے دیے۔ چاند کی کشتی کا تنہا مسافر، روشنی کی کرن، نئی دھڑکن۔ آج افسانے کے منظر نامے پر رضاء الجبار کا نام بہت اہمیت کا حامل ہے۔ اسی طرح بہت سی شخصیتیں ہیں جنھوں نے معذوری کے باوجود کامیابی کی ایک نئی تاریخ رقم کی جس پر ہمارا صحت مند معاشرہ بھی عش عش کرتا ہے۔ Frida Kahlo ایک نمایاں مثال ہیں۔ میکسیکو کی مشہور مصورہ جو پولیو زدہ تھیں۔

رخسانہ نازنین نے بھی اپنی معذوری کے باوجود ادبی دنیا سے نہ صرف اپنا رشتہ قائم رکھا ہے بلکہ اپنی شناخت بھی قائم کی ہے۔ افسانہ، شاعری، مضمون نگاری تینوں سے ان کا تعلق ہے اور ہندوستان کے بیشتر رسائل و جرائد میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی رہی ہیں۔ ان کے تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ طوبیٰ (2010)، ضیا (2012)، پس دیوار (2019) اور خوشی کی بات یہ ہے کہ ان کے افسانوں کا پنجابی اور مراٹھی میں بھی ترجمہ ہوا ہے۔ دستک کے عنوان سے ان کے مضامین کا مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ کئی ادبی اداروں سے ان کی وابستگی ہے۔ وہ بیدر جنت نشان کی نائب مدیرہ کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ کئی اکادمیوں سے انھیں ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔ ان سے حقانی القاسمی نے خواتین کے مسائل و متعلقات پر گفتگو کی ہے۔ پیش ہیں ان کے انٹرویو کے کچھ اقتباسات:

"فیمینزم کی وبا نے مشرقی تہذیب کو پامال کیا ہے"

سوال: کیا آپ Gender discrimination پر یقین رکھتی ہیں؟

جواب: میں جنسی امتیاز میں یقین نہیں رکھتی۔ یہ وہ مہلک نظریہ ہے جس نے سماج میں تباہی پھیلا رکھی ہے۔ دختر کشی کے رجحان کو فروغ دیا ہے۔

جس سے لڑکیوں کا تناسب گھٹ رہا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے عورت کو بڑا بلند درجہ عطا کیا ہے۔ اس کا وجود جنت کی نوید ہے۔ چاہے وہ ماں کے قدموں میں ملے یا بیٹی کی بہتر پرورش کے انعام کے طور پر ملے۔ پھر بیٹی، بیٹے کے درمیان تفریق کیوں؟

سوال: کیا عورت ذہنی اور جسمانی اعتبار سے کمزور ہے؟

جواب: نہیں۔ عورت انسانی وجود کی بقاء کا باعث ہے۔ درد و کرب کا دریا عبور کر کے تخلیق کے مراحل سے گزرتی ہے۔ ذہنی اعتبار سے بھی قوی ہے کہ اس نے خلاء تک رسائی حاصل کر لی ہے۔

سوال: توانائی کے تمام مراکز پہ کنٹرول کے باوجود عورت کمزور کیوں کہلاتی ہے؟

جواب: فطری طور پر عورت نرم دل اور معصوم ہوتی ہے۔ ایک پل میں خفا ہوتی ہے، دوسرے ہی پل مان جاتی ہے۔ کسی بھی بات پہ یقین کر لیتی ہے۔ جذباتی طور پر اسے کمزور کہا جاتا ہے۔ لیکن میری دانست میں یہ کمزوری نہیں بلکہ اس کی طاقت ہے۔ اس کی نرم دلی اور معصومیت دلوں کو تسخیر کر سکتی ہے۔

سوال: مسلم معاشرے کی خواتین تعلیم، صحت اور انصاف کے

باب میں دوسروں سے پچھڑی ہوئی کیوں ہیں؟

جواب: میں نہیں مانتی کہ مسلم معاشرے کی خواتین تعلیم، صحت اور انصاف کے باب میں دوسروں سے پچھڑی ہوئی ہیں۔ کیونکہ مسلم معاشرے میں لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کا رجحان تیزی سے فروغ پا رہا ہے۔ مسلم لڑکیاں، ڈاکٹرس، انجینئرس، بزنس وومین، لیکچررس غرض ہر شعبے میں بہترین کارکردگی دکھا رہی ہیں۔ صحت کے معاملے میں بھی ان کا موقف بہتر ہے۔ البتہ دیہات کی خواتین اور نچلے طبقے کی خواتین صحت کے مسئلے سے دوچار ہیں۔ جس کا سبب غربت اور جہالت ہے۔ انھیں بہتر طبی امداد بروقت میسر نہیں۔ البتہ شہری علاقوں میں یہ مسئلہ اتنا سنگین نہیں ہے۔

> ”مرد اور عورت ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں“

سوال : کیا دیہی خواتین اپنے حقوق، اختیارات اور فلاحی اسکیموں سے آگاہ ہیں؟

جواب: کافی حد تک نہیں۔ دوردرشن کے کئی پروگراموں سے دیہی خواتین کو کافی معلومات حاصل ہوئی ہیں لیکن ابھی ان میں شعور اور بیداری کے لیے بہت محنت کرنی ہے۔ باقاعدہ تحریکیں چلانی پڑیں گی۔

سوال: کیا Social Conservatims عورتوں کی تعلیم، ترقی اور آزادی کی راہ میں رکاوٹ ہے؟

جواب: نہیں۔ اب سماج میں عورتوں کے تعلق سے نظریے تبدیل ہوئے ہیں۔ دقیانوسی خیالات بدلنے لگے ہیں۔ عورتوں کو اظہار رائے کا حق حاصل ہے۔ لیکن یہ دائرہ مخصوص ہے۔ اس کی حدیں مقرر ہیں۔ روک ٹوک، نکتہ چینی اب بھی ان پر حاوی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن اب اسے رکاوٹ بھی نہیں کہا جاسکتا کیونکہ یکایک سب کچھ تو نہیں بدلے گا۔ کچھ سمجھوتے تو کرنے ہی پڑتے ہیں اور یہ عورت کے لیے فائدہ مند ہی ہیں۔ وہ غلط فیصلے نہیں کرسکتی اور محفوظ رہتی ہے۔

سوال: فیمینزم سے عورتوں کو فائدہ ہوا ہے یا نقصان؟

جواب: میرے خیال میں تو نقصان ہی ہوا ہے۔ فیمینزم کی وبا نے مشرقی تہذیب کو پامال کیا ہے۔ عورتیں بازاروں کی زینت بن گئی ہیں۔ بنا تفریق مذہب عورت اپنی نسوانیت کھوتی جارہی ہے۔

سوال: کیا مرد کے بغیر عورت کے وجود کو مکمل مانتی ہیں؟

جواب: نہیں۔ عورت مرد کے بغیر ادھوری ہے۔ اس کے وجود کی تکمیل مرد سے ہی ہوتی ہے۔ یہی قانون قدرت ہے۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ یہی فطرت کا تقاضہ ہے۔

سوال: کیا یہ سچ نہیں کہ انیسویں صدی کے اواخر میں رام موہن رائے اور ودیا ساگر کی اصلاحی تحریکوں کے بعد ہی فیمینزم کو آواز ملی؟

جواب: یہ سچ ہے کہ راجہ رام موہن رائے اور ودیا ساگر کی تحریکوں سے خواتین بالخصوص ہندو سماج کی خواتین کو راحت ملی۔ ستی کا خاتمہ ہوا۔ کم عمری میں شادی کرنے کا رواج ختم ہوا۔ بیوہ عورتوں کی دوسری شادی کی طرف توجہ دلائی گئی۔ لیکن اب خواتین جہیز کے لیے زندہ جلائی جا رہی ہیں۔ فیمینزم کا انھیں تو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ انھیں اب کسی اور مسیحا کا انتظار ہے۔

سوال : ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ممتاز علی، مولانا حالی نہ ہوتے تو کیا عورتیں اپنے حقوق کی جنگ لڑ پاتیں؟

جواب: نہیں۔ بے شک ڈپٹی نذیر احمد نے تعلیم نسواں کی اہمیت کو اپنی تحریروں میں اجاگر کیا۔ ’تہذیب نسواں‘ کے ذریعے مولوی ممتاز علی

نے خواتین میں بیداری لانے کا اہم رول ادا کیا۔ ان سبھوں نے عورتوں کے حقوق کے لیے آواز بلند نہ کی ہوتی تو آج عورت زندگی کے ہر شعبے میں اپنی کامیابی کے نقوش نہ چھوڑتی۔ قدامت پسند گھرانوں میں دبی کچلی عورتیں جاگیر کی مانند استعمال کی جاتیں۔ جن کی اپنی مرضی تھی نہ خواہش۔ ان کے جائز حقوق بھی سلب کر لیے جاتے اور زبان بندی ان کی تقدیر ہوتی۔

سوال: عورتوں کے رسائل اور اخبارات زیادہ تر مردوں نے نکالے تو پھر حق تلفی کا شکوہ بیجا کیوں؟

جواب: عورتوں کے رسائل اور اخبارات بے شک زیادہ تر مردوں نے نکالے ہیں لیکن ان کی صلاحیتوں کا برملا اعتراف کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں۔ اور فنی خامیوں کو یہ کہہ کر اجاگر کیا جاتا ہے کہ 'ظاہر ہے خاتون ہے تو ایسا ہی ہوگا!' یعنی ان کی دانست میں خواتین کم فہم ہیں۔ شکوہ اسی بات کا ہے۔ ہر شعبے میں زیادہ تر ایوارڈز پر مردوں کا قبضہ ہے اور یہ حق تلفی ہی تو ہے۔

سوال: کوئی تو وجہ ہوگی کہ مردوں کے حقوق کے لیے confidane نامی تنظیم قائم کرنی پڑی جس کے ممبران میں خواتین بھی شامل ہیں۔؟

جواب: نہایت ہی حیرت کا مقام ہے کہ مردوں کے حقوق کے لیے بھی تنظیمیں قائم کی جا رہی ہیں۔ یہ ہماری مشرقی تہذیب کا حصہ تو نہیں ہے۔ یہاں تو مرد ہر رشتے میں قابل تعظیم ہے۔ جہاں عزت و احترام ہو وہاں حق تلفی کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ مردوں کے یہ کون سے نام نہاد حقوق ہیں جن کے لیے باقاعدہ تنظیم قائم کی گئی ہے۔ میری سمجھ سے بالاتر ہے۔

سوال: آخر Male Victims کے لیے عورتیں آواز کیوں نہیں بلند کرتی ہیں؟

جواب: شاید اس لیے کہ غیر ارادی طور پر ان کے کسی انتقامی جذبے کی تسکین ہوتی ہے۔

سوال: کیا عورت وجود کی جنگ لڑتے لڑتے عصمت و وقار کی جنگ ہار چکی ہے؟

جواب: نہیں۔ عورت اپنی عصمت اور وقار کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے وجود کی جنگ لڑ رہی ہے۔ کیونکہ عصمت و وقار ہی اس کا وجود ہے۔ یہی نہ رہا تو وجود بھی بے معنی ہو جائے گا۔ عورت کی پہچان ہی اس کا تقدس ہے۔

سوال: مرد کی آوارگی اور بے راہ روی میں عورت کو کتنا حصے دار مانتی ہیں؟

جواب: آوارگی کا تعلق فطرت سے ہے۔ صنف سے نہیں۔ اس لیے اس میں مرد اور عورت کی حصے داری مانی نہیں جا سکتی۔

سوال: کیا آزادیِ نسواں کے نام پر Adultery میں اضافہ نہیں ہو رہا ہے؟

جواب: بالکل ہو رہا ہے۔ آزادیِ نسواں کے پر فریب نعرے نے خواتین کو صرف خسارے سے دوچار کیا ہے۔ عدم تحفظ کا احساس بخشا ہے۔ ذہنی بیماریاں اسی نعرے کی دین ہیں۔ کیونکہ عورت کی محفوظ پناہ گاہ اس کا گھر ہے اور شوہر اس کا محافظ۔

سوال: آزادیِ نسواں کے سوال پر خواتین دو خانوں میں منقسم کیوں ہیں؟

جواب: اس لیے کہ آزادیِ نسواں کا نعرہ دو الگ تہذیبوں پہ الگ طرح سے اثر انداز ہوا ہے۔ مشرقی تہذیب کی دلدادہ خواتین کے لیے یہ ایک فریب ہے۔ کیونکہ وہ جانتی ہیں کہ انھیں سماجی طور پر جتنی آزادی درکار ہے وہ انھیں حاصل ہے۔ رہی بات مغربی تہذیب سے متاثر خواتین کی تو انھیں آزادیِ نسواں کا سنہرا فریب پرکشش لگتا ہے۔ اپنی ناآسودہ خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ لگتا ہے۔ اپنے وجود کے مقصد سے ناآشنا، گھریلو ذمے داریوں اور فرائض سے فرار حاصل کر کے آزاد رہنا چاہتی ہیں۔ اس لیے یہ دو خانوں میں منقسم ہیں۔

> **"آوارگی کا تعلق فطرت سے ہے۔ صنف سے نہیں"**

سوال: خانگی تشدد مردوں کے خلاف ایک انتقامی ہتھیار ہے؟

جواب: ہے بھی اور نہیں بھی۔ خانگی تشدد کی مختلف نوعیت ہوتی ہے۔ کچھ مرد واقعی عورتوں پہ بیجا ظلم ڈھاتے ہیں۔ مثلاً شراب نوشی یا جہیز وغیرہ کی وجہ سے عورتوں پہ تشدد ہوتا ہے۔ لیکن کئی واقعات ایسے بھی ہو رہے ہیں کہ عورتیں انتقامی جذبے کے تحت مردوں کو سبق سکھانے کے لیے اس کا غلط استعمال کر رہی ہیں۔ جب ان کے بے جا مطالبات تسلیم نہ کیے جائیں تو خانگی تشدد کا الزام لگا کر مردوں کو پریشان کیا جا رہا ہے۔

سوال: کیا عورتوں کا empowerment مردوں کا endangerment بنتا جا رہا ہے؟

جواب: ایسا نہیں ہے۔ عورتوں کا عروج مردوں کے زوال کا سبب نہیں ہے۔ بلکہ ایک مستحکم زندگی کا ضامن ہے۔ بشرطیکہ اعتدال پسندی کا جذبہ شامل حال رہے۔ عورتیں اور مرد اپنی اپنی ترقی اور کامیابی کے زعم

میں مبتلا ایک دوسرے کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچائیں بلکہ ایک دوسرے کا احترام کیا جائے۔

سوال: کیا سماج میں صرف عورتیں ہی Harassment کا شکار ہوتی ہیں؟

جواب: نہیں۔ اکثر مرد بھی Harassment کا شکار ہوتے ہیں۔ لیکن ان کا چرچا نہیں ہوتا۔ مرد اپنی اَنا اور غیرت کی خاطر خاموش رہتے ہیں۔

سوال: کیا آپ کو نہیں لگتا کہ جہیز مخالف اور خانگی جنسی تشدد قوانین کا بہت غلط استعمال ہو رہا ہے؟

جواب: دیکھئے۔ ہر بات کے منفی اور مثبت پہلو ہوتے ہیں۔ یہ آپ پہ منحصر ہے کہ اس کا استعمال کیسے کیا جائے۔ یہ قوانین عورتوں کو انصاف دلانے کے لیے ہیں۔ جو واقعی اس کی مستحق ہیں۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ کچھ ناعاقبت اندیش خواتین اپنے بے جا مطالبات منوانے اور مرد کو اپنا تابع بنائے رکھنے کی خواہش کے مطابق اس کا غلط استعمال بھی کر رہی ہیں۔ یہ ایک خطرناک رجحان ہے جو مشرقی عورت کے تصور کو پامال کر رہا ہے۔ اس سے ان خواتین کی حق تلفی ہو رہی ہے جو حقیقی معنوں میں اس کی مستحق ہیں۔

سوال: عورت خود ہی Commercial Proposition بننے کے لیے بیتاب ہو تو پھر مرد معاشرہ پہ الزام کیوں؟

جواب: ہاں۔ یہ عورت کی کم عقلی اور بے وقوفی ہے کہ خود نمائی، خود پسندی اور خود مختاری کے جنون میں مبتلا ہو کر وہ ایک تجارتی شئے بن گئی ہے۔ لیکن مرد بھی اس کے ذمے دار ہیں کہ وہ اس کی بے وقوفی سے اپنا اُلو سیدھا کر رہے ہیں اور اس کا استعمال کر کے جنسی اور مالی فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔

سوال: آج کی عورت بہشتی زیور سے باہر آ چکی ہے۔ پھر بھی اس کے ہونٹوں پر بے بسی، بے کسی اور مظلومیت کی فریاد کیوں ہے؟

جواب: آج کی عورت بہشتی زیور سے باہر آ چکی ہے لیکن ابن آدم نے اپنی خو نہ بدلی ہے۔ اس لیے بنت حوا اب بھی بے بسی اور بے کسی کے جال میں مقید ہے۔ مردوں کی بالا دستی، حاکمانہ رویہ بدستور قائم ہے۔ عورت چاہے کتنی ہی تعلیم یافتہ ہو، کتنے ہی اعلیٰ عہدے پہ فائز ہو، کتنی ہی دولت مند ہو لیکن کسی نہ کسی طور پر مردوں کے سامنے بے بس ہے۔

"اس کی نرم دلی اور معصومیت دلوں کو تسخیر کر سکتی ہے۔"

سوال: کیا آپ کو نہیں لگتا کہ عورتیں مظلومیت کا فسانہ سناتے سناتے خود ظالم بنتی جا رہی ہیں؟

جواب: بحیثیت عورت میں عورت کی طرف داری نہیں کر رہی ہوں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ آج بھی عورت پر ظلم ہو رہا ہے۔ بلکہ ظلم کی نوعیت اور بھی سنگین ہو گئی ہے۔ آج اس کی عصمت خطرے میں ہے۔ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ عورتوں کے خلاف جرائم اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ وہ کیسے کیسے ستائی جا رہی ہے۔ ترقی یافتہ سماج میں عورت آج بھی مظلوم ہے۔

سوال: کچھ خواتین کا کہنا ہے کہ مردوں کے مقابلے میں عورتیں ان کا زیادہ استعمال کرتی ہیں؟

جواب: ہاں۔ یہ بھی ایک المیہ ہے کہ عورت ہی عورت کی دشمن ہے۔ عورت کی زندگی مختلف رشتوں کے تانے بانے میں الجھی رہتی ہے۔ اپنی رشتوں میں وہ عورت ہی کی مشق ستم ہوتی ہے۔ ایک عورت اپنی ناکامیوں اور نا آسودگیوں کا انتقام دوسری عورت کی خوشیوں کو تباہ کر کے لیتی ہے۔ جو ظلم اس پہ ہوئے وہی ظلم وہ دوسری عورت پہ ڈھاتی ہے۔ اور یہ سلسلہ چلتا رہا ہے۔

"عورت کی محفوظ پناہ گاہ اس کا گھر ہے اور شوہر اس کا محافظ"

سوال: زر، زمین کے ساتھ زن کو فساد کی جڑ کیوں کہا جاتا ہے؟

جواب: فطری طور پر عورت کی جو نسوانی کشش ہے وہ مردوں کی کمزوری ہے۔ عورت کا حصول مردوں کا جنون ہے۔ ہابیل و قابیل نے ایک عورت کے لیے ہی تو دنیا کا پہلا قتل کیا تھا۔ کسی بھی فساد میں کسی نہ کسی طور پہ عورت ضرور ملوث ہوتی ہے۔

سوال: آپ کی ترقی اور کیریئر پر ازدواجی زندگی کے کتنے منفی اور کتنے مثبت اثرات پڑے ہیں؟

جواب: اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم ہے کہ مجھے جو بھی ترقی یا کامیابی ملی اس میں میرے شوہر کا بھرپور تعاون ملا۔ میں تو یوں بھی ہر طرح سے اپنے شوہر پر ہی انحصار کرتی ہوں اور انھوں نے مجھے ہمیشہ ذہنی اور جذباتی سہارا دیا۔ ازدواجی زندگی میرے کیریئر سے یا میرا کیریئر ازدواجی زندگی سے متاثر نہ ہوئے۔ بلکہ شوہر کے تعاون کے سبب میں نے کامیابی سے اپنا ادبی سفر جاری رکھا ہے۔

سوال: میاں بیوی کے مابین Toxic relationship کے کیا اسباب ہوتے ہیں؟

جواب: ایک دوسرے پر عدم اعتماد۔ بے اعتباری۔ عورت کا اپنی کامیابی کا غرور اور مرد کا احساس کمتری اور شکی مزاج۔ ایک دوسرے سے حد درجہ توقعات اور ان کے نہ پورے ہونے پر اختلافات اس کے اسباب ہیں۔

سوال: کامیاب بیویوں سے مرد کیوں خائف رہتے ہیں؟

جواب: کہیں نہ کہیں ان کے اندر یہ خوف چھپا ہوتا ہے کہ اب بیوی اپنی کامیابی کے زعم میں مبتلا ہو کر انھیں خاطر میں نہ لائے گی۔ بلکہ ان کو کسی کمزوری کا طعنہ بھی دینے لگے گی۔ ممکن ہے وہ ان کے قابو میں نہ رہے۔

سوال: کیا عورت تنہا اپنی نسائیت کے تحفظ میں کامیاب ہو سکتی ہے؟

جواب: نہیں۔ عورت مرد کے سہارے کی محتاج ہے۔ چاہے وہ باپ، بھائی، شوہر یا بیٹا ہو۔ کسی بھی رشتے کے حوالے سے وہ مرد کے بغیر محفوظ نہیں۔ تنہا عورت کی زندگی پل صراط کی مانند ہوتی ہے۔

سوال: من کی کوئی ایسی بات جو دنیا سے شیئر کرنا چاہتی ہوں؟

جواب: 'من کی باتیں من میں ہی رہیں تو بہتر ہے'۔ یہ ہم عورتوں کا نجی خیال ہوتا ہے۔ لیکن من کی کچھ باتیں کہنے سے من ہلکا بھی ہو جاتا ہے۔ 'میرے من کی دنیا میں بس یہی دکھ پیرا کیے ہوئے ہے' یہی درد لیے میں جی رہی ہوں، کچھ سوال من میں ہلچل مچائے رکھتے ہیں تو دنیا والوں سے پوچھنے کی کبھی جرأت نہ کر پائی۔ لیکن آج یہ نوک زاویہ پہ مچل ہی گئے کہ سماج میں مکمل اور نامکمل لوگوں کے الگ الگ دائرے کیوں مخصوص ہیں؟ کیوں انھیں انسان نہیں سمجھا جاتا؟ بلکہ ان کی معذوری کے حوالے سے انھیں ایک نام دے دیا جاتا ہے اور وہی ان کی پہچان بنا دی جاتی ہے۔! اپنی ایک شناخت بنانے کے لیے وہ چاہے کتنی ہی جدوجہد کریں۔ اپنی شخصیت سے چپکا یہ لیبل نہیں مٹا سکتے۔

اللہ تعالیٰ کی مصلحت وہی جانے۔ ہمیں تو صبر و شکر سے اس کے ہر فیصلے پہ راضی بہ رضا ہونا ہے۔ میں بچپن میں پولیو سے متاثر ہوئی۔ دونوں پیر مفلوج ہوئے۔ والدین نے علاج میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ لیکن کوئی علاج کارگر نہ ہوا۔ میری تعلیم و تربیت پہ خصوصی توجہ دی۔ یہ انہی کی نیک اور صالح تربیت کا اثر ہے کہ میں نے اپنی معذوری کے ساتھ خود اعتمادی سے جینے کا حوصلہ پایا۔ لیکن لوگوں نے میری ذات کے ساتھ لفظ 'بے چاری' جوڑے رکھا۔ یہ ایک لفظ اور ہمدردی بھری ایک نگاہ ایک پل میں میرے حوصلے کو مسمار کر دیتی ہے لوگوں نے میرے والد صاحب کی بھی پہچان میری معذوری سے وابستہ کر دی۔ ان کا ذکر ہوتا یا مکان کا پتہ دریافت کیا جاتا یا کوئی اور بات ہوتی تو یوں کہا جاتا۔ ''مظفر صاحب جن کی بیٹی لنگڑی ہے۔'' وہ لوگ یہ نہیں جان پائے کہ ان کے لفظوں نے ہمارے دلوں کو کیسے گھائل کیا۔ بچپن سے آج تک ہر لمحہ، ہر پل میرے ٹوٹنے، بکھرنے اور اور سنبھلنے کا عمل جاری ہے جسے میں نے اپنے ایک شعر میں بیان کیا ہے۔

ٹوٹتے ہیں اور بکھرتے ہیں، سنبھل بھی جاتے ہیں
ذات اپنی اک تماشہ ہے بدلتے دیکھ لو

اپنی ذات کا تماشہ بنتے ہوئے دیکھنا اور سہنا کتنا صبر آزما مرحلہ ہے۔ یہ وہی جانتا ہے جو اس کرب سے گزرا ہو۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے صبر کی دولت سے نوازا۔ میں نے بڑی خوبی سے خود کو سنبھالے رکھا۔ میری خوش مزاجی کی مثال دی جاتی ہے۔ میری موجودگی محفل کی رونق دوبالا کرتی ہے۔ ہنسنے، ہنسانے، خوش رہنے اور خوش رکھنے کے فن سے آگاہ ہو کر میں ایک خوشگوار زندگی بسر کر رہی ہوں۔ ماحول بھی سازگار رہا۔ سسرال والوں نے بھی خوش دلی سے اپنایا۔ شوہر مخلص، ہمدرد اور غمگسار ہیں جنھوں نے میری معذوری کے ساتھ مجھے اپنایا۔ لیکن وہ بھی سوالوں کے گھیرے میں رہتے ہیں کہ 'آخر کس طرح وہ ایک معذور عورت کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ یعنی ہماری ازدواجی زندگی کے متعلق بھی شکوک و شبہات کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ماں بننے کے اعزاز سے نوازا ہے۔ میرا چودہ سالہ بیٹا نویں جماعت کا طالب علم ہے۔ جو دنیا والوں کو آٹھواں عجوبہ لگتا ہے۔ کیوں؟ کیونکہ مجھے یا مجھ جیسے کسی معذور مرد یا عورت کو ایک عام انسان نہیں سمجھا جاتا۔ کیونکہ اپنے رویوں سے ہمیں یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ ہم میں کوئی کمی ہے۔ وہ بات جسے ہم بھولنا چاہتے ہیں، بار بار یاد دلائی جاتی ہے۔ لوگ شعوری یا لاشعوری طور پر ہمارے زخموں کو کریدتے رہتے ہیں۔ میں اسی سبب اپنی حقیقت کے

> ''سماج میں مکمل اور نا مکمل لوگوں کے الگ الگ دائرے کیوں مخصوص ہیں؟ کیوں انہیں انسان نہیں سمجھا جاتا؟ بلکہ ان کی معذوری کے حوالے سے انہیں ایک نام دے دیا جاتا ہے اور وہی ان کی پہچان بنا دی جاتی ہے۔''

اظہار سے گریز کرتی ہوں کہ یہ جاننے کے بعد کہ میں معذور ہوں ۔لوگ مجھے ہمدردی کی بھیک دینے لگیں گے۔اور میری صلاحیتوں کونظرانداز کردیا جائے گا۔جبکہ میں اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر اپنی ایک پہچان چاہتی ہوں۔جو بفضل تعالیٰ مجھے ملنے لگی ہے۔اب میں نے اپنی سوچ کا زاویہ بدلا۔اللہ تعالیٰ کا بے پایاں کرم اور حبیب پاک کا صدقہ ہے کہ ان حالات میں بھی ایک کامیاب زندگی گزار رہی ہوں تو اس کا اظہار کیوں نہ کروں؟ ہوسکتا ہے کہ کسی اور کو میری زندگی سے حوصلہ ملے اس کے اندر بھی جینے کی امنگ جاگے۔یہی بات میں دنیا سے شیئر کرنا چاہتی ہوں کہ جسمانی طور پر معذور لوگوں کے ساتھ اس طرح رویہ رکھیں کہ وہ خود کو بے بس نہ محسوس کریں بلکہ خود کو مضبوط بنائیں۔

سوال :آپ کی کوئی خواہش،کوئی خواب جس کے پورا نہ ہونے کا ملال ہو؟

جواب:

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارماں پھر بھی کم نکلے

میری زندگی اس شعر کی تفسیر ہے اور خوابوں کا کیا؟ خوابوں کی قسمت میں تو ٹوٹنا ہی لکھا ہے۔میرے بھی خواب تھے کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرتی۔ایک معزز عہدے پہ فائز ہوتی۔لیکن یہ خواب بکھر گئے۔میں ان کی کرچیاں چنتی رہ گئی۔

سوال:عملی طور پر آپ نے حقوق نسواں کے لیے کیا کیا؟

جواب :اپنی تحریروں کے ذریعے صدائے احتجاج بلند کیا ہے۔عورتوں کے ساتھ ہوئی ہر نا انصافی اور ظلم کو میں نے اپنے افسانوں اور مضامین میں مختلف انداز سے پیش کیا ہے۔

Cell:9891726444

haqqanialqasmi@gmail.com

Subscription Form "Mahnama Khwateen Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'ماہنامہ خواتین دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/منی آرڈر.................................. بتاریخ..................................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'ماہنامہ خواتین دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون:011-26109746 فیکس:011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

کرمند وششر
ترجمہ: عبدالسمیع

مسلم نشاۃ ثانیہ کی عظیم رہنما

بی اماں

(1852-1924)

نشاۃ ثانیہ کے باب میں مسلم خواتین کے کردار پر سنجیدگی سے بحث نہیں کی گئی ہے اور نہ تلاش و تحقیق کی کوئی منضبط کاوش سامنے آئی ہے۔ میرے علم میں واحد کوشش ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین کی ہے، جنھوں نے ''ہندوستان کی تحریک آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ'' میں اس گمشدہ روایت کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے۔ محدود ماخذ کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ نشاۃ ثانیہ میں مسلم خواتین کی مضبوط حصہ داری تو رہی ہے لیکن اسے بہتر طور پر نمایاں نہیں کیا گیا ہے۔ میں نے اپنی تحقیق کے دوران منتشر صورت میں جو کچھ دیکھا ہے، اگر ان سب کو اکٹھا کرکے ان کی تحقیق و تدوین ہو تو میرا یقین ہے کہ نشاۃ ثانیہ میں مسلم خواتین کے عظیم کردار سامنے آسکتے ہیں۔ یہ ایک ضروری کام ہے جسے ہر حال میں کیا جانا چاہیے۔

تاریخ میں تیرہویں صدی میں رضیہ سلطان (1205-1240) کے تاریخی کردار کو ڈاکٹر رام منوہر لوہیا اکثر دہرایا کرتے تھے۔ اس کے باوجود سماج اور دیش نے ان کو وہ مقام نہیں دیا، جس کی وہ حقدار تھیں۔ پھر لمبے عرصے کے بعد انقلاب 1857 میں مسلم خواتین کے کافی حوالے دیے جاتے ہیں۔ عہد وسطیٰ سے قبل 1857 تک کا بھی باریکی اور سنجیدگی سے مطالعہ ہونا چاہیے اور نادریافت حوالوں کو ایک سلسلے میں پرو دیا جانا چاہیے۔

1857 میں حضرت بیگم محل اور ان کے ساتھ وابستہ متعدد مسلم خواتین کی مثالیں ملتی ہیں۔ لکشمی بائی کی ایک بوقلموں مسلم سہیلی کے بارے میں بھی، خود کو شہید کردینے کی ایک گاتھا دیکھنے کو ملتی ہے۔ کان پور کی عزیزن بائی کے انقلابی کردار کو اب قابل افتخار طریقے سے یاد کیا گیا لیکن مظفر نگر کی حبیبہ اور رحیمی جیسی انقلابی خواتین گمنام ہی بنی رہ گئیں جبکہ انگریزوں نے ان کو پھانسی کے تختے پر لٹکایا تھا۔ اسی ضلع کی اصغری بیگم کو تو انگریزوں نے زندہ جلا دیا تھا۔

ہندوستانی نشاۃ ثانیہ کے مختلف الجہت ارتقا کے ساتھ بڑی تعداد میں مسلم خواتین متحرک نظر آتی ہیں۔ انھوں نے تحریر، صحافت، سماجی، تعلیمی اور سیاسی سطح پر غیر معمولی خدمات انجام دیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کے مختلف کردار اور خدمات کا سنجیدہ اور تفصیلی مطالعہ کیا جائے اور اسے 'محرک فکر' کی شکل میں استعمال کیا جائے۔ آج تمام طرح کی حد بندیوں کے باوجود مسلم خواتین مختلف میدانوں میں اپنی قابل ذکر سرگرمیوں سے نت نئی تاریخ رقم کررہی ہیں، جدید تعلیم اور فکر کے تئیں ان میں بہت تیزی سے بیداری بھی آئی ہے۔ یہ تبدیلی ایک تاریخی ارتقائی تسلسل میں ہی رونما ہوتی ہے اس لیے نشاۃ ثانیہ کی طرف بار بار دیکھنے کی ضرورت ہے۔ پورے

ہندوستانی معاشرے میں اور خاص طور پر مسلم خواتین کے سیاق میں روایتوں کی شکست، قدیم وجدید کے تصادم اور جدوجہد کو برداشت کرنا آسان نہیں، لیکن معاشرتی ارتقا کا عمل اپنے تسلسل میں ضروری تبدیلی کرتا رہتا ہے، جس کی سمت متعین کرنے والے لوگ سامنے آتے رہتے ہیں۔ مسلم معاشرے کو نسبتاً سست رفتاری سے تبدیل ہونے والا اور سخت بندشوں میں یقین رکھنے والا سماج تصور کیا جاتا ہے، لیکن اپنے مذہب اور سماج کی اخلاقی حدود کا پاس رکھتی ہوئی جن مسلم خواتین نے ایک نئی اور محرک روایت کو جنم دیا ان میں ''بی اماں'' کا نام جدید تاریخ میں عزت سے لیا جائے گا۔ انھوں نے اپنے جرأت مندانہ کارناموں سے سماج کے اندر نشاۃ ثانیہ کی نئی نظیر پیش کی۔

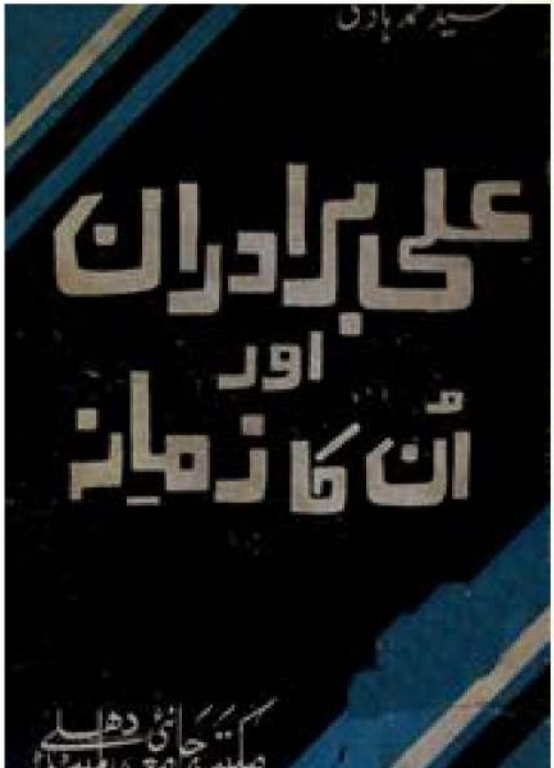

بی اماں کا اصل نام آبادی بانو تھا۔ وہ اترپردیش کے امروہہ ضلع مرادآباد کی رہنے والی تھیں۔ ان کی پیدائش کے بارے میں ان کے بیٹے محمد علی جوہر نے لکھا ہے کہ ''وہ بتاتی تھیں کہ 1857 کے انقلاب کے وقت ن کی عمر پانچ چھ سال کی رہی ہوگی۔'' اس بنیاد پر ان کا قیاس ہے کہ آبادی بانو کی ولادت 1852 میں ہوئی ہوگی۔ ان کا نکاح ریاست رام پور کے وفادار عبدالعلی کے ساتھ ہوا تھا۔ ان کی بود و باش کا انداز کچھ ایسا شاہانہ تھا کہ غیر معمولی خاندانی دولت کے باوجود وہ مقروض ہوگئے۔ قدرت نے ان کے ساتھ ایسی ناانصافی کی کہ بھری جوانی میں وہ ہیضے کے شکار ہوئے اور ان کا انتقال ہوگیا۔ یہ بات بیوہ آبادی بانو کو بعد میں معلوم ہوئی کہ شوہر چھ اولاد کے ساتھ پورے تیس ہزار کا قرضہ بھی سونپ گئے ہیں۔ محض 27 برس کی عمر بیوہ کے سامنے پہاڑ جیسی زندگی پڑی تھی۔ خیرخواہوں نے نصیحت دی کہ پھر سے گھر بسالو، یہ سنتے ہی آبادی بانو کی رگوں میں دوڑتا خاندانی افتخار ابل کر باہر آگیا:

''تم لوگ میرے رتبے اور درجے کو نہیں پہچانتے۔ میں رامپور کی رہنے والی نہیں ہوں۔ میں امروہہ ضلع مرادآباد کی رہنے والی ہوں، جو اعلیٰ درجہ کے سیدوں سے بھرا ہوا ایک قصبہ ہے اور میرے باپ تو نہیں لیکن میرے دادا اور پردادا بادشاہان دہلی کے دربار میں وزارت کے مناصب پر فائز تھے..... خبردار جو اب کسی نے ایسی بات منھ سے نکالی۔ یہ میرے چھ لخت جگر، مجھے کیا کم ہیں۔ میری عمر بھر کی خدمت اور جاں نثاری کے لیے بس یہ کافی ہیں۔..''

(علی برادران اور ان کا زمانہ، سید محمد ہادی، ص: 15-14)

اس اقتباس سے بی اماں کے اصول، جذبے، اندر کی تپش، عزم آہن اور زندگی میں درپیش مسائل کا سامنا کرنے کی جرأت ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ وہ انیسویں صدی کا ہندوستان تھا، جب مسلم معاشرے کی پابندیاں سخت تھیں۔ انھوں نے اپنے ایمان و مذہب کے تحفظ کے ساتھ مشکلات سے نبردآزما ہونے کا ارادہ کرلیا۔ دل کو مضبوط کیا، پردے میں رہ کر ہی اپنی جائیداد کی دیکھ بھال شروع کردی۔ شاہی خرچے پر لگام کسا لیکن بچوں کی پرورش میں کوتاہی نہیں برتی۔ اس وقت سب سے چھوٹے بیٹے محمد علی کی عمر محض دو برس کی تھی۔ ان کی دلیری اور ہمت مثالی تھی، لیکن جس بات نے آبادی بانو کو بی اماں بنایا اور وہ نشاۃ ثانیہ کی عظیم قائد بنیں، وہ مستقبل شناسی کا نایاب نظریہ تھا۔ ان کے دیور چاہتے تھے جائیداد کا ایک حصہ بیچ کر قرض ادا کردیں اور بچوں کو مدرسہ میں داخل کردیں۔ مسلم معاشرے کی یہی وہ روایت تھی جس سے آبادی بانو نے بغاوت کی۔ وہ جائیداد کو بچوں کی امانت تصور کرتی تھیں اور ہر حال میں بچوں کو جدید انگریزی تعلیم دینے پر آمادہ تھیں۔ اپنے ایک قابل اعتماد بینکر کے پاس زیورات گروی رکھوا دیے اور بچوں کو پہلے قریب ہی انگریزی اسکول اور پھر علی گڑھ بھیجا۔ مولانا محمد علی نے اپنے رسالہ ''کامریڈ'' (نومبر 1924) میں ان کی یاد میں بہت ہی دل سوز یادداشت لکھی تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''وہ خود معمولی کپڑا پہنتیں اور ہمارے لیے جامدانی کے

کپڑے بناتیں۔۔۔وہ خود چولائی کی سبزی پر گذارا کرتیں۔“

(ہندوستان کی تحریک آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین، صفحہ 53)

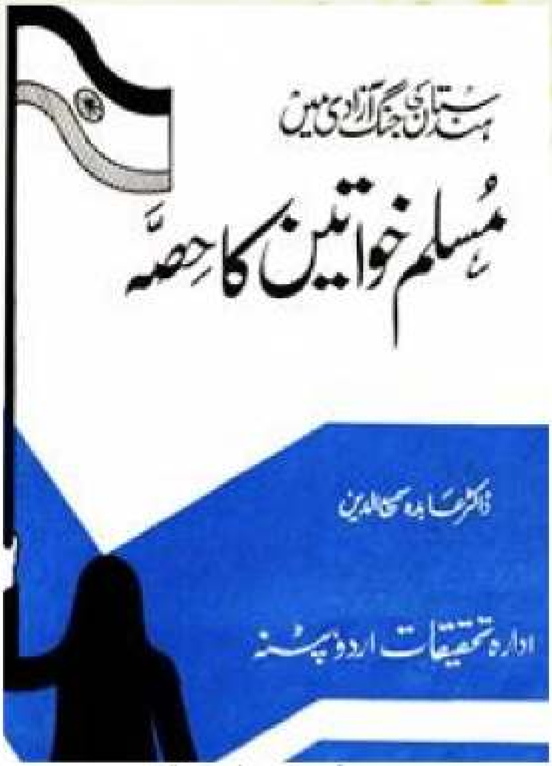

بی اماں کی سیاسی زندگی کا آغاز پہلی جنگ عظیم کے بعد ہوا۔ جب ترکی جرمنی کے ساتھ چلا گیا اور شکست کے بعد مکہ پر دشمنوں کا قبضہ ہو گیا۔ دنیا بھر کے مسلمان مضطرب ہو گئے۔ جس طرح محمد صاحب نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی تھی، اسی طرز پر ہندوستانی مسلمان ہند سے مکہ ہجرت کر جانے پر آمادہ رہتے ہیں۔ اس مسئلہ سے نبرد آزما ہونے کے لیے انگریزوں نے ”قانون تحفظ ہند“ بنایا تھا۔ اسی دوران ’لندن ٹائمس‘ کے ایک اشتعال انگیز مضمون پر محمد علی نے تلخ زبان میں اپنے ردعمل کا اظہار کیا۔ اسی بنیاد پر علی برادران کو چھندواڑہ میں نظر بند کر دیا گیا۔ بی اماں بھی چھندواڑہ جا کر رہنے لگیں۔ اس وقت ملک میں ”ہوم رول“ تحریک زور پکڑ چکی تھی، جس میں اینی بیسنٹ بھی نظر بند ہو گئی تھیں۔ ملک میں جگہ جگہ مظاہرے ہو رہے تھے۔ ایسے ہی ایک عوامی اجلاس کی صدارت فرما رہے سبرامنی آئر کے نام بی اماں کا ایک خط پڑھا گیا۔ انھوں نے نظر بندی سے متعلق لکھا تھا: ”یہ صرف ایک عزت ان ہی لوگوں کے لیے ہے جن کو خدا اپنے ملک اور اپنے مذہب کی خاطر تکالیف برداشت کرنے کے لیے منتخب کرتا ہے۔“

(4/اگست 1917) یہ خط نہ صرف متاثر کن زبان میں لکھا گیا تھا بلکہ اس میں سیاسی فکر و دانش بھی تھی۔ جب اسے اینی بیسنٹ کی نظر بندی کے خلاف منعقدہ عوامی اجلاس میں پڑھ کر سنایا گیا تو بی اماں کا نام لوگوں کے دل و دماغ میں جاگزیں ہو گیا۔ اس خط میں بی اماں نے لکھا تھا کہ وہ نہ صرف مسلمان عورت ہیں بلکہ ان کی پرورش بھی پرانی وضع کے مطابق ہوئی ہے۔ جس میں کسی عورت کا اجنبی مرد سے خط و کتابت مناسب نہیں سمجھا جاتا:

”زمانہ اتنی تیزی سے بدل رہا ہے اور اس کی رفتار عجیب ہے کہ اگر مجھ جیسی پرانے خیال کی عورت اس اصول قدیم کو بھلا کر ایک ایسے معزز اور محترم شخص کو خط لکھے، جن کا تمام عالم مداح ہے اور پھر خط کا مضمون بھی وہ ہو جو آج سب کے دلوں میں جاگزیں ہے تو کوئی تعجب خیز بات نہیں۔۔۔۔گو میں ضعیفہ ہوں لیکن ان تبدیلیوں کا خیر مقدم کرتی ہوں جو ہمارے گرد و پیش وقوع میں آ رہی ہیں۔“ (ایضاً، ص:55)

آپ ان کے سخت مذہبی اعتقاد کے پس منظر میں ان افکار پر غور کیجیے۔ ’غیر مردوں کو خط لکھنا پرانی وضع کے خلاف ہے، جسے آج بدلتے وقت کے ساتھ تبدیل ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے وہ اسے مذہب کے ساتھ وابستہ کر کے نہیں دیکھتیں۔ درپیش حالات (یعنی اینی بیسنٹ کی نظر بندی کی مخالفت) نے انھیں ایسا کرنے پر مائل کیا۔ وقت اور حالات جس برق رفتاری سے تبدیل ہو رہے تھے بی اماں ان تبدیلیوں کا خیر مقدم کرتی ہیں۔ روایت کی کون سی بات ترک کرنی ہے اور جدت کو کس طرح قبول کرنا ہے یہی دانشمندی نشاۃ ثانیہ کی دین رہی ہے۔ ایسی متوازن فکر کے ساتھ ان کی سیاسی سرگرمی کا آغاز ہوا۔ ہوم رول تحریک کی حمایت اور اینی بیسنٹ سے ملاقات نہ ہونے پر افسوس کا اظہار کرتی ہیں اور انھیں مبارکباد دیتے ہوئے لکھتی ہیں: ”پورے ہندوستان کے نوجوان، بوڑھے، ہندو اور مسلمان سب کی دعائیں ان کے حق میں ہیں۔“ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سخت معاشی تنگی کے باوجود وہ دس روپیہ ماہوار چندہ بھی دیتی ہیں۔ یعنی بی اماں تن من دھن سے اس تحریک میں شامل ہو گئیں۔ انھوں نے اپنے حالات بیان کرتے ہوئے اپنے اعتماد کا اظہار ایک محاورے کے ذریعہ کیا کہ ’خدا کی زمین تنگ نہیں اور ہمارے پیر لنگ نہیں۔‘ یہاں خدا پر یقین کامل کے ساتھ ان کی خود اعتمادی بھی ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ وطن کے لیے جد جہد سے متعلق وہ لکھتی ہیں:

”میرے بیٹے جوان اور تندرست ہیں۔ سارے ملک میں ان کے اتنے دوست احباب ہیں کہ جو مدد چاہیے ان کو خوشی سے مل

سکتی ہے، لیکن مجھ ماں کا دل ان سینکڑوں بدنصیب بہادر لڑکوں کے غم میں خون روتا ہے جو بغیر دادفریاد کے مجرم قرار دیے گئے ہیں۔'' (ایضاً،ص:57)

ممتا کا یہی وہ عظیم جذبہ تھا جس نے انھیں آبادی بانو سے بی اماں بنا دیا۔ سراینی آئر کے نام 4/ستمبر 1917 کو لکھے خط میں 'وندے ماترم' کے بارے میں لکھتی ہیں: ''چند سال گزرے کہ ''بندے ماترم'' کا نعرہ جو ایک بے ضرر بلکہ قابل تعریف نعرہ ہے، بنگال میں باغیانہ خیال کیا جاتا ہے اور اس کی وجہ سے بہت سے محبان وطن کو تکلیف اور اذیتیں برداشت کرنی پڑیں۔''

وہ آگے لکھتی ہیں:

''[وہی بہادر] نوجوان بنگالی جوان الفاظ کے زبان پر لانے سے سزائیں جھیلتے تھے۔اب اس کو اپنی جگہ مقبول جنگی نعرہ کی طرح میدان جنگ میں اپنی جان دینے کے وقت استعمال کرتے ہیں اور ہمیشہ کے واسطے اپنی قوم اور اپنی مردانگی کے دامن کو بدنما دھبے سے پاک کردیتے ہیں۔'' (ایضاً،ص:59)

جس نعرے کو کچھ تشدد پسند ایک قوم سے جبراً ادا کرانے کی کوشش کرتے ہیں، اسی نعرے سے متعلق اس کی ایک بہادر کے خیالات کتنے مثبت ہیں۔ بی اماں نے اپنے خط میں اس واقعے کا بھی ذکر کیا ہے جب خفیہ انسپکٹر ان سے تفتیش کرنے آیا تھا اور وہ زنان خانے سے نکل کر وہاں پہنچ گئی تھیں:

''میں نے نو مہینے ان کو پیٹ میں رکھا، ان کی ابتدائی عمر میں ان کو دودھ پلایا، اور ہمارے رسول اکرمؐ نے ان کو بتایا کہ ان کی جنت میرے قدموں کے نیچے ہے۔ اپنی طویل جلاوطنی اور نظر بندی کے زمانے میں انھوں نے جتنی تکلیف اٹھائی ہے اس سے بخوبی آگاہ ہونے کے باعث یہ بھی سمجھتی ہوں کہ ان کے لیے کسی ایسی شرط کو مسترد کردینا کیسا سخت ہوگا جن کے قبول کرنے میں زمانہ دراز کی ان صعوبات کا خاتمہ ہوسکتا ہے لیکن میں یہ چاہتی ہوں کہ گورنمنٹ یہ جان لے کہ اگر اپنی تکالیف سے بچنے کے لیے وہ کسی ایسی بات پر اقرار کریں گے جو ان کے مذہبی احکام یا ملکی فوائد کے ذرا بھی خلاف ہو تو مجھے یقین ہے کہ اللہ پاک میرے قلب کو اتنی مضبوطی اور ان سوکھے جھریاں پڑے ہاتھوں میں اتنی طاقت دے گا کہ میں اسی وقت دونوں کا گلا گھونٹ دوں گی۔''

(ایضاً،ص 62-63)

اس اقتباس سے ان کی حب الوطنی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اپنی بیسنٹ اپنی نظر بندی ختم ہونے پر علی برادران کی رہائی کے لیے وائسرائے سے ملنے گئیں۔ ان کے نام 11/ستمبر 1917ء کو لکھے طویل خط میں بی اماں نے اپنی پریشانیوں کے تذکرے کے بعد ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا ہے۔ اس میں ترکی کے مسئلے کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ یہ مسلمانوں کے لیے اہم کیوں ہے۔ اس ضمن میں اس وقت کی دنیا سے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے ان کی سیاسی دانشمندی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتی ہیں کہ ایسے حالات میں حکومت کو کیا قدم اٹھانا چاہیے:

''ہم کو مسلمانان ٹرکی سے جو ہمدردی اور سلطان ٹرکی سے جو روحانی عقیدت ہے وہ ہمارے ناقابل تغیر مذہب کا ایک لازمی وضروری جزو ہے، جس میں کسی قسم کی تبدیلی ممکن نہیں، انھیں وجہ سے عملی اور مجہول ہمدردی میں جو امتیاز پیدا کیا گیا ہے ہم مسلمانوں کے لیے ناقابل فہم ہوگیا ہے۔'' (ایضاً،ص:70)

بی اماں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ جرأت اور سنجیدگی کے ساتھ اپنی بات پرزور طریقے سے رکھنا جانتی ہیں۔ وہ برطانوی حکومت کو دھمکی آمیز لہجے میں لکھتی ہیں:

''اگر گورنمنٹ کا منشا سات کروڑ مسلمانوں کو ان کے مذہبی فرض ادا کرنے سے روکنے کا ہے تو چند مسلمانوں کی نظر بندی خواہ وہ کیسے ہی عزیز مذہبی اور سیاسی رہنما کیوں نہ ہوں، بہت معمولی سزا ہے۔'' (ایضاً،ص:73)

یہ اس ماں کے الفاظ ہیں جس کے دو بیٹے نظر بند تھے۔ وہ صاف کہتی ہیں کہ 'حیات وموت اللہ کے لیے ہے۔ اس لیے کوئی سچا مسلمان نظر بندی، زنداں یا موت سے ڈرسکتا ہے؟' مذہب کے تعلق سے وہ بار بار اپنے والہانہ جذبہ کا اظہار کرتی ہیں۔ بی اماں کے مضبوط دل میں ممتا کے جذبات بڑے گہرے تھے۔ 'قانون تحفظ ہند' کی وجہ سے نظر بندی کے مصائب برداشت کرنے والوں کی رہائی کے لیے چندہ اکٹھا کرنا ضروری قرار دیتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

'' آئے دن ان مصیبت زدوں کے دردناک قصے سنے جاتے ہیں جن کو سن کر کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ ان کو گورنمنٹ نے آزادی سے محروم کردیا ہے اور پھر ان کو اس بات کا بھی اختیار نہیں کہ کمائی کرکے اپنے بال بچوں کا پیٹ بھرسکیں ..... یہاں تک کہ ایسی حالتوں میں خودکشی کی خبریں بھی سنی گئی ہیں۔''

(ایضاً،ص:73)

وہ صحیح معنوں میں ملک کے مظلوموں اور مجاہدین آزادی کی اماں

تھیں۔ بہار کے شاہ آباد، گیا اور پٹنہ کے فسادات کا تذکرہ کرتے ہوئے مصیبت زدوں کے تعلق سے انھوں نے گہری ہمدردی اور دکھ کا اظہار کیا۔ وہ اپیل کرتی ہیں کہ ایسے واقعات دوبارہ نہ ہوں۔ آخر میں وہ اعتماد کے ساتھ اپنی فتح کا یقین دلاتے ہوئے صبر کی تلقین اور دعا کے ساتھ اپنا خط مکمل کرتی ہیں۔ یہ پورا خط جہدِ آزادی کا ایک نایاب دستاویز بن گیا ہے۔ بعد میں ترکی کے مسئلے پر ان کی سرگرمی کم ہوگئی اور رفتہ رفتہ ان کے پیغام کی زبان میں بھی ترشی آنے لگی۔ 30/ ستمبر 1917 کو کلکتہ میں منعقدہ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں پیش کیا گیا ان کا پیغام کچھ ایسا ہی تھا۔ پورے عالم اسلام سے ہمدردی رکھنے کے بارے میں انھوں نے لکھا تھا: ''اگر حکومت کے نزدیک یہ ہمدردی بغاوت ہے تو صرف شوکت علی اور محمد علی ہی باغی نہیں، ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمان باغی ہیں۔''

ان کے اندر مذہب کے لیے جو راسخیت تھی وہی وطن پرستی کے لیے بھی تھی۔ اسی فکر اور دانشمندی کی بنا پر وہ بی اماں ہو سکتی تھیں۔ جب انھیں بتایا گیا کہ آپ کے پیغام کے بعد کئی سامعین رو رہے تھے، تو انھوں نے کہا: ''یہ رونے کا نہیں کام کرنے کا وقت ہے۔''

تحریک آزادیِ ہند کے قائد مہاتما گاندھی خواتین کی سیاسی سرگرمی کے تئیں کشادہ قلب نہیں تھے۔ ان کے اندر ایک خاص طرح کی جھجک تھی۔ شاید انھیں یہ لگتا تھا کہ اس سے رجعت پسند ہندوستانی سماج ناراض ہو سکتا ہے۔ خاص طور سے مسلم خواتین کو مخاطب کرتے ہوئے وہ مزید احتیاط برتتے تھے۔ شیکھر بندھوپادھیائے نے اس مسئلے پر تفصیلی بحث کرتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ گاندھی جی مرد وزن کے 'فطری تقسیم فرائض' کی بات کرتے ہوئے ان کی خانگی ذمہ داریوں کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ مسلم خواتین سے وہ ملک اور اسلام کے لیے شہادت دینے کی گزارش کرتے تھے۔ 'ملک' کے ساتھ 'اسلام' کو وابستہ کرنے کے پس پردہ ان کا مقصد مسلم سماج کو تھوڑا موافق کرنا رہا ہو۔ وہ کتائی، غیر ملکی کپڑوں اور شراب کی دکان پر مظاہرہ جیسے کاموں تک ہی ان کی خدمتِ وطن کو محدود رکھنا چاہتے تھے۔ شیکھر بندھوپادھیائے نے لکھا ہے کہ 1921 کی تحریک عدم تعاون میں انھوں نے مخالفت اور سودیشی تحریک میں شامل ہونے کے لیے عورتوں سے اپیل کی، لیکن ان کی رضامندی کا انتظار کیے بغیر بمبئی اور کلکتہ جیسے شہروں میں وہ سڑک پر اتر کر سیاسی مظاہروں کی قیادت کرنے لگیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''جہاں تک مسلم خواتین کا سوال تھا 1921 میں تحریک خلافت و عدم تعاون میں کئی خواتین نے حصہ لیا۔ ممکن ہے اس سے پردے کی پابندیوں پر چوٹ پڑی ہو لیکن اس کے مکمل خاتمے کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کیونکہ مسلمانوں کے لیے وہ ثقافتی نشان امتیاز ہے۔''

(پلاسی سے تقسیم تک، شیکھر بندھوپادھیائے، ص 426-425)

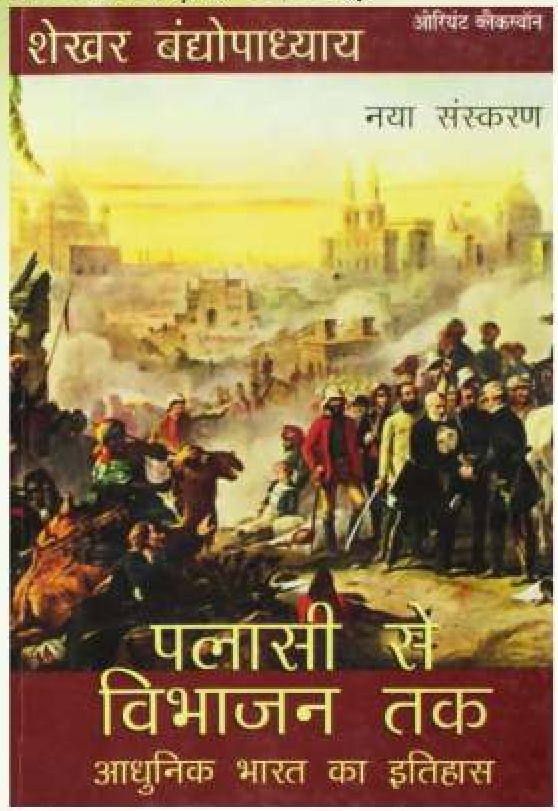

پردہ سسٹم کے مکمل خاتمے کی بات تو ہندوؤں کے ساتھ بھی ناممکن تھی۔ سوال اس کو آگے بڑھ کر توڑنے کا تھا۔ یہ پہلا اور تاریخی قدم بھی بی اماں نے اٹھایا۔ جب انھوں نے پنجاب کے ایک عوامی اجلاس میں اپنا برقع اٹھایا اور حاضرین کو اپنا بچہ کہہ کر مخاطب کیا۔ ظاہر ہے اس میں کوئی ڈراما نہیں تھا بلکہ ایک مثبت انقلابی فکر کا عملی اظہار تھا۔ شیکھر جی لکھتے ہیں: ''ایک ماں کو اپنے بچوں کے سامنے پردے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اس طرح مضمر طور پر پورا ملک ان کے 'وسیع تصوراتی خاندان' کا جزو بن گیا۔ ان کے اس عمل سے پردہ سسٹم کو ضرور چوٹ پہنچی ہوگی۔ دوسری طرف، یہ بات کافی حد تک ناممکن نظر آتی ہے کہ 'تحریک ترک موالات' میں حصہ لینے والی ہزاروں عورتوں نے اپنے سرپرستوں کی اجازت لی ہوگی۔'' وہ آگے لکھتے ہیں: ''انھوں نے بار بار گاندھی کے ان احکام کی خلاف ورزی کی، جو ان کی سرگرمی پر قدغن لگاتے تھے۔'' (ایضاً، ص 426) مسلم خواتین کے سیاق میں بی اماں کا کارنامہ کوئی واحد مثال نہیں ہے۔ بیسویں صدی

کے ابتدائی دور میں مسلم خواتین کے ایسے رسائل اور تخلیقات شائع ہونے لگی تھیں، جن میں سماج کی روایتی حد بندیوں سے آگے نکلنے کی گونج سنائی دیتی ہے لیکن یہ بھی واضح رہے کہ ایسی فکر کے خلاف بھی ایک محاذ اپنا کام کر رہا تھا۔

30/دسمبر 1921 کو احمد آباد میں منعقدہ 'کل ہند خواتین کانگریس' کی صدارت بی اماں نے کی، جس میں کستوربا گاندھی اور سروجنی نائیڈو جیسی کئی فعال اور معروف ہندو مسلم خواتین حصہ لے رہی تھیں۔ اس وقت بی اماں کا دیا گیا صدارتی خطبہ ان کی فکر، عزم اور آرزوؤں ہی کو ظاہر نہیں کرتا ہے بلکہ ان کی آہنی شخصیت کو بھی نمایاں کرتا ہے۔ ان کے اندر اسلام کے لیے راسخ عقیدہ تھا، انھوں نے اپنی تقریر خلوص وللّٰہیت کے ساتھ ہی شروع کی۔ ان کی سوچ بالکل درست تھی کہ:

"جس وقت تک ہندوؤں، مسلمانوں، سکھوں اور پارسیوں میں کامل اتحاد اور اتفاق نہ ہو ہم ملک کو آزاد نہیں کرا سکتے اور نہ پرامن و باعزت زندگی بسر کر سکتے ہیں۔" وہ آگے تفصیل سے بتاتی ہیں کہ مسلمان بادشاہوں کے دور میں ہندو مسلمان ساتھ ساتھ زندگی بسر کرتے تھے، مگر انگریزوں نے آ کر ان میں پھوٹ ڈالی۔ یہ اس دور کے تمام محبّ وطن رہنماؤں کی سوچ تھی۔ بی اماں کوئی پڑھی لکھی خاتون نہیں تھی لیکن ان کو آزادیِ وطن کی راہ میں جو اہم رکاوٹ اسے وہ بہتر طور پر سمجھتی تھی۔ بی اماں کی یہ بات ذرا حیرت میں ڈالتی ہے کہ انگریزوں کے تعلق سے ان کے اندر کوئی غیر منطقی یا اندھی نفرت نہیں تھی بلکہ جدید فکر تھی۔ وہ کہتی ہیں: "ہم عیش پسندی اور کاہلی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، جو دوسروں نے ہمارے لیے مہیا کی ہیں اور جو ہم نے یورپ کی اچھی عادتوں کے مقابلے میں بری عادتیں سیکھی ہیں۔" (ہندوستان کی تحریک آزادی میں مسلم خواتین کا حصہ، ڈاکٹر عابدہ سمیع الدین، ص 102)

آپ غور کیجیے وہ 'کاہلی' کے خلاف بیداری کا جوش پیدا کر رہی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ہم کو خود اٹھ کر اپنے حالات بدلنے ہوں گے۔ دوسری بات یورپ کی 'بری عادتیں' اختیار کرنے کی۔ یعنی ہمیں یورپ سے اچھی عادتیں سیکھنے سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ جدت کو قبول کرنے کی یہی سمجھ بی اماں کو نشاۃ ثانیہ کی عظیم رہنما بناتی ہے۔ ان باتوں کو پڑھتے ہوئے یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ تعلیم یافتہ نہیں تھیں۔ وہ یہ بھی بتاتی ہیں کہ ہندوستان کی بیماری کا علاج برطانوی ڈاکٹر کے پاس نہیں بلکہ ہندوستانیوں کے پاس ہے۔ اس میں ان کے اندر کی پرسوز آواز صاف صاف سنائی دیتی ہے۔ وہ بدلتے ہوئے حالات کو درست طور پر پہچان ہی نہیں رہی تھیں بلکہ عوام کو ان سے آگاہ بھی کر رہی تھیں۔ وہ درخواست کرتی ہیں کہ:

"اب اس کا وقت آ گیا ہے کہ ہر وہ مرد- عورت جس میں ذرہ برابر ایمان اور خودداری ہے، اسے اپنے کو خداوند تعالیٰ کی فوج کا سپاہی سمجھنا چاہیے۔ ہم ہندوستانیوں میں ہر مرد اور عورت والنٹیر ہیں۔"

(ایضاً، ص 104-103)

اس فقرے پر غور کیجیے؛ 'ذرہ برابر ایمان اور خودداری' یہ ایک بہادر کی للکارتی ہوئی زبان ہے۔ اس میں روشن خیالی اور بیداری کی آواز زیادہ نمایاں ہے۔ یہ بات آگے مزید واضح ہو جاتی ہے:

"میں تم پر زور ڈال کر کہتی ہوں کہ پروردگار عالم کے سوا کسی سے نہ ڈرو لیکن اس کے ساتھ اپنے کو کسی وقتی خیال سے مرعوب بھی نہ ہونے دو۔ ہمارے ملک کی حالت اب بہت زیادہ نازک ہے اور اسی کے ساتھ ہمارا فرض بھی کچھ کم نازک نہیں ہے۔ قید خانوں سے خوف نہ کھاؤ لیکن اس کے ساتھ اپنے مذہبی اور سوشل زندگیوں کو بھی فراموش نہ کرو۔۔۔" (ایضاً، ص 104)

آپ غور کیجیے، ان میں غضب کی جرأت کے ساتھ ساتھ حیرت انگیز توازن بھی ہے۔ وہ کہیں بھی جذبات کی رو میں نہیں بہتیں۔ بے باکی اور جرأت کے ساتھ اپنے مذہب کے تئیں پرخلوص اور صدق جذبے کو کہیں بھی کمزور نہیں پڑنے دیتی ہیں۔ عرفان حبیب صاحب نے بتایا کہ 'چرخہ' عرب سے آیا تھا۔ بی اماں کہتی ہیں: "کیا پیغمبرؐ نے کھدر نہیں پہنا؟ اس لیے میرے بھائیو! میری خواہش ہے کہ تم سیدھے راستہ چلو اور ملک کے سپاہی بن جاؤ، دلیر بن جاؤ، خدا تمھیں عزت بخشے۔" (1921 میں بمبئی خطاب، صفحہ 104) بی اماں کی تقریروں کے مطالعے کے دوران متحیر کر دینے والی دانشمندی، فکر نیز خفیف سا تجسس بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔

علی برادران جب تک جیل میں رہے بی اماں کی سیاسی سرگرمیاں بے تکان جاری رہیں۔ ان کی رہائی کے بعد بھی وہ آرام سے نہیں بیٹھیں۔ اب وہ ملک کی ایک معروف خاتون رہنما بن چکی تھیں۔ 1923 میں جب بڑے بیٹے مولانا شوکت علی کاٹھیاواڑ جیل سے رہا ہوئے تو ان سے ملنے گئیں۔ محمد علی نے اپنی یادداشت میں ایک دل چھو لینے والا واقعہ بیان کیا ہے کہ بڑے بھائی ان کی صحت کے پیش نظر ان کو سیاسی سرگرمیوں سے الگ رہ کر آرام کرنے کا مشورہ دیتے تو وہ مذاق کرتیں: "تو مجھ پر رشک

کرتا ہے کہ یہ بڑھیا میرے برابر ملک وقوم کی خدمت نہ کرسکے۔ یہ مجھ سے ہرگز نہ ہوسکے گا کہ گھر پر پڑی رہوں اور اپنے ملک و مذہب کی کوئی خدمت نہ کرسکوں۔" (ہمدرد، 11 نومبر 1924) (ایضاً،ص:106)

واقعی یہ رشک کرنے والی ہی شخصیت تھی۔ اس میں ملک اور مذہب کے تعلق سے جو یکساں جذبہ تھا وہ ابوالکلام آزاد جیسی بلندی رکھتا تھا۔ بی اماں کی صحت تیزی سے گر رہی تھی۔ علاج کے لیے وہ دلی، مسوری اور رامپور گئیں۔ ان کے دونوں بچوں (شوکت علی اور محمد علی) کے رامپور جانے پر حکومت نے پابندی عائد کردی تھی، ریاست کے نواب نے برطانوی حکومت کے خلاف ان دونوں بھائیوں کو اپنی سرحد میں داخل ہونے سے روک دیا تھا۔ دونوں بیمار ماں سے ملنے کے لیے آئے تو انھیں اسٹیشن پر ہی روک دیا گیا۔ بی اماں نے سنا تو پاؤں پیدل دوڑتی ہوئی آئیں اور اپنے 'لختِ جگر' کے ساتھ ضد کرکے دلی آگئیں۔ جن دنوں وہ دلی میں علاج کے لیے رکی تھیں انھی دنوں کوہاٹ اور دیگر مقامات پر رونما ہونے والے فسادات سے افسردہ ہوکر مہاتما گاندھی نے اکیس دنوں کی بھوک ہڑتال کا اعلان کیا۔ وہ مسلمان کے گھر میں رہ کر بھوک ہڑتال کرنا چاہتے تھے، اس کے لیے انھوں نے مولانا محمد علی کے گھر کا انتخاب کیا۔ حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور خاص طور سے مولانا محمد علی بہت پریشان ہوئے۔ مولانا شوکت علی بمبئی سے بھاگے بھاگے آئے۔ سب کو لگا اگر کہیں کچھ ناگہانی ہوگئی تو وہ داغ برداشت نہیں کر پائیں گے۔ گاندھی جی کی ضد تو سب پر عیاں تھی۔ جوٹھان لیا وہ کرنا ہے۔ آخری حربہ بی اماں کی طرف سے اختیار کیا گیا۔ انھوں نے پیغام بھیجا کہ: "تم تو مجھے ماں کہتے ہو، تو میرا حکم مانو اور اپنا ارادہ بدل لو۔" گاندھی جی نے کہا: "...اگر اس معاملے میں اپنی سگی ماں کی بات مانتا تو میں ضرور آپ کی بات مان لیتا۔" اس تاریخی بھوک ہڑتال کا تفصیلی تذکرہ ہوا۔ راج موہن گاندھی نے اقبال کے "محمد علی" یادداشت سے گاندھی کا یہ بیان نقل کیا ہے: "مجھے محمد علی کی چھت کے نیچے جو اپناپن اور بہتر انتظام مل رہا تھا ویسا کبھی نہیں ملا۔ مجھے کس چیز کی ضرورت ہوگی اس کا اندازہ وہ لوگ پہلے ہی لگا لیتے ہیں۔ گھر کے ہر فرد کی اہم فکر مجھے مسرت اور راحت دینے کی ہے۔" (ایضاً،ص:129)

13-12 نومبر 1924 کی آدھی رات کو ملک کی اس ماں کا انتقال ہوگیا۔ 17-16 نومبر 1924 کے 'ہمدرد' میں مہاتما گاندھی نے لکھا:

"جیسے اپنی سگی ماں کے لیے کہنے میں یہ مشکل ہوتی ہے ویسے ہی بی اماں کے لیے کہنے میں ہے۔ میں نے 1917 میں ان کی زیارت کی تھی۔ اس وقت سے بی اماں کو جانتا ہوں۔ تحریک عدم تعاون کے وقت بی اماں نے ملک کا دورہ کیا تھا۔ بی اماں ایک مسلمان کی حیثیت سے دورہ کررہی تھیں کہ اسلام پر مصیبت ہے۔ تو جس جگہ چاہے اسلام کے لیے کچھ کہتی تھیں وہاں ہندو مسلم کے اتحاد اور ہندوستان کی آزادی کے لیے بھی ضرور کہتی تھیں۔ وہ ہمیشہ یہی کہتی تھیں کہ میں ہندوستان میں سوراج، ہندو مسلم اتحاد دیکھنا چاہتی ہوں۔ جب تک ہندو مسلمان ایک ہوکر بھائیوں کی طرح نہیں رہ سکتے، آزادی ناممکن ہے۔ ہم کو اپنے مذہب پر قائم رہتے ہوئے اتحاد کرنا چاہیے۔ جب تک ایسا نہیں ہوگا، ہم غلام رہیں گے۔" (ایضاً،ص:109-108)

ان کے انتقال پر ملک بھر میں تعزیتی نشستیں ہوئیں۔ ہندی، اردو، انگریزی و دیگر زبانوں کے اخبارات اور رسائل میں خبریں شائع ہوئیں۔ متعدد اہم رہنماؤں کی طرف سے تعزیتی قرارداد پیش کی گئی۔ پھر بھی تاریخ میں ان کو وہ مقام نہیں دیا جاسکا جس کی وہ حق دار تھیں۔ ایک مسلم خاندان کی غیر تعلیم یافتہ عورت، عین شباب میں بیوہ ہوکر اپنے شوہر کی وراثت سنبھالتی ہے۔ چھ بچوں کی پرورش و پرداخت کرکے ایک کو لندن بھیج کر پڑھاتی ہے۔ پردے اور مذہب کی حدبندی میں رہ کر اپنی غیر معمولی شخصیت کا اظہار کرتی ہے۔ جس کے دو بیٹے شوکت علی اور محمد علی تحریک آزادیِ ہند کی مرکزی سیاست میں رہے۔ وہ عورت خاندان کی روایتی حدبندیوں کو توڑتی ہوئی ایک دن تمام مجاہدین آزادیِ ہند کی ماں-بی اماں-بن جاتی ہے۔ جسے گاندھی جی اپنی سگی ماں کا درجہ دیتے ہیں۔ جو اسلام اور آزادی کو آمیز کرکے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا درس دیتی ہے اور تحریک آزادی میں اپنی قوم اور ملک کی خواتین کے اندر نشاۃ ثانیہ کا جوش پیدا کرکے نئی تاریخ قائم کرتی ہے۔ ایک غیر تعلیم یافتہ مسلم خاتون کی شخصیت کے ایسے حیرت انگیز ارتقا کی مثال تحریک آزادی کی تاریخ میں تلاش کرنے پر شاید ہی ملے۔ کبھی کبھی دل سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ کیا معلوم اس دور نے بی اماں کو پیدا کیا تھا یا بی اماں نے اس عہد کی تخلیق کی تھی۔ زمانہ گزر جاتا ہے۔ شخص بھی چلا جاتا ہے۔ لیکن اس کے خیالات، اس کا جذبہ روشن رہ جاتا ہے۔ جسے آنے والی نسلیں اپنے وقت کے لیے سنبھال کر رکھتی ہیں۔ بی اماں تاریخ کی ایسی ہی سنبھالی جانے والی وراثت ہے۔

Abdus Sami
Assistant Professor
Department of Urdu
BHU, Varanasi 221005 (U.P)

شاعرات کے منتخب اشعار

وفا میں کون ہے میرا مقابل
جفا میں کون ہے تیرا مقابل

بہارِ صحبتِ یاراں تو گزری
اور اب ہے یاد کا صحرا مقابل

ناہید اختر

میں سوہنی تو نہ تھی پھر بھی کیسے ڈوب گئی
کوئی گھڑا تھا نہ دریا کو پار کرنا تھا

آتا مری تلاش میں اک شہ سوار کیوں
میں کوئی شاہزادی نہیں تھی ، پری نہ تھی

رفیعہ شبنم عابدی

ہر ایک شہرِ نگاراں سمجھ رہا تھا مجھے
ذرا قریب سے دیکھو دھواں دھواں ہوں میں

کسی سے بھیڑ میں چہرہ بدل گیا ہے مرا
تو سارے آئینہ خانوں سے بدگماں ہوں میں

وفا لکھنوی

تمام رات تراشے حسیں حسیں پیکر
تمام رات فنِ آزری نے ساتھ دیا

اک عمر کھو کے ہاتھ لگی ہے متاعِ غم
پھر کیوں اسے حیات کا حاصل نہ کہا جائے

سیدہ شان معراج

زمانے بھر کے دکھوں کو گلے لگایا ہے
یہ حوصلہ ہے کہ ہم پھر بھی دل فگار نہیں

یوں تو خوش رنگ ہیں ہر سمت مری دیواریں
کوئی تو تازہ ہواؤں کے لیے در نکلے

مسعودہ حیات

رشتۂ درد کا احساس دلاتا ہے مجھے
یاد آتا ہے تو پہروں وہ رلاتا ہے مجھے

یہ بھی سچ ہے کہ ہے مٹی سے محبت مجھ کو
اور کہیں دور سے دریا بھی بلاتا ہے مجھے

صدیقہ شبنم

اڑ گئے نیند کے پرندے بھی
آنکھ ویران سی حویلی ہے

دور تک چاند ہے نہ تارے ہیں
آج تو رات بھی اکیلی ہے

مظفر النساء ناز

حسین یادیں گزرتی ہیں اس طرح دل سے
کہ جیسے مصر سے یوسف کا کارواں گزرے

ذوقِ نگاہِ عشق میں ہر شئے ہے آئینہ
جس سمت دیکھیے ترا چہرہ دکھائی دے

سیما نظمی

ڈاکٹر شبنم آرا

ہمعصر معاشرہ اور عصمت چغتائی کا نقطۂ نظر

عصمت چغتائی (پیدائش 21 اگست 1915 کو بدایوں میں ہوئی اور 24 اکتوبر 1991 کو بمبئی میں وفات پائی) کا شمار اردو کے ان گنے چنے باکمال ادیبوں میں ہوتا ہے جو ہمارے افسانوی ادب میں ایک علاحدہ دبستان کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ عصمت چغتائی کی باغی لیکن باغ و بہار شخصیت نصف صدی تک اردو افسانے کے افق پر چھائی رہی۔ انھوں نے سماج میں عورت کے استحصال کے خلاف نہ صرف قلم اٹھایا بلکہ اسے ایک بغاوت کی شکل میں منتقل کر دیا اور تمام پابندیوں کے بیچ اپنی آواز میں احتجاج بلند کیا اور کبھی کسی تنقید یا تنبیہ کے آگے سر تسلیم خم نہیں کیا۔ عصمت چغتائی دراصل افسانہ نگاروں کی اس نسل سے تعلق رکھتی ہیں جس میں بیدی، کرشن چندر اور منٹو جیسے فن کار پیدا ہوئے لیکن ان تمام معاصرین سے قطع نظر عصمت چغتائی نے اپنے ماحول اور معاشرے کی حقیقی پیشکش ہی کو اپنے فن کی بنیاد بنایا۔ گرچہ ان کی بے باکی اور صاف گوئی نے انھیں ایک متنازعہ شخصیت بنا دیا تھا مگر ان سب کے باوجود وہ زندگی بھر ادب کے افق پر جگمگاتی رہیں اور ایک بڑے تخلیق کار کی ذمہ داریوں سے کبھی غافل نہیں رہیں۔ انھوں نے نئی نسل کے ادیبوں خصوصاً خاتون افسانہ نگاروں کی دل کھول کر حوصلہ افزائی کی۔ انھیں جرأت، بے باکی اور روشن خیالی کا درس دیا اور اپنے حقوق کے لیے اکسایا۔

عصمت چغتائی کو اردو فکشن کی خاتون اول کہا گیا ہے۔ یہ خیال اس لحاظ سے درست نہیں ہے کہ ان کی شہرت اور بڑائی کا انحصار ان کے خاتون ہونے پر نہیں بلکہ ان کی غیر معمولی تخلیقی صلاحیت اور مشاہدہ کی وسعت پر ہے اور اس پر ہے کہ انھوں نے زندگی کی ان سچائیوں سے آنکھیں ملانے کی ہمت کی جن کو ان سے قبل کے افسانہ نگاروں نے نظر

انداز کیا تھا۔ ان کے پیش رو تخلیق کاروں میں خواتین بھی تھیں اور مرد بھی لیکن ان میں سے بیشتر کی نظر ان کھردری لیکن گہری حقیقتوں تک نہیں پہنچی تھی جن کو عصمت نے موضوع بنایا اور اگر پہنچی تو قدامت پسندی کے ماحول میں وہ انھیں پیش کرنے کی جرأت نہ کر سکے۔ ان میں متوسط طبقہ کے نوجوانوں کی جنسی گھٹن بھی ہے اور اعلیٰ طبقہ کی بداعمالی اور ریاکاری بھی عورت کا جنسی استحصال بھی ہے اور بے میل شادی اور ہم جنسی کی لعنتیں بھی۔ عصمت جوازلی باغی تھیں اور اپنے معاشرہ کی بڑی سفاک نکتہ چیں تھیں۔ ہر طبقہ کے انسانی رشتوں کو اپنے مخصوص زاویہ نگاہ سے دیکھتی تھیں جوان کی بے باکی اور وسعت نگاہ کا آئینہ دار ہے۔ لیکن ان کی بے باک اور بے رحم حقیقت نگاری میں طنز کی جو دھار ہوتی ہے اس کے پیچھے ان کی دردمندی اور برہمی کی لہروں کو بھی دیکھا جاسکتا ہے۔

عصمت چغتائی سے قبل اردو فکشن میں عورتوں کا وجود تو تھا مگر وہی روایتی عورت جو ایثار و وفا کی دیوی، شوہر پرست بیوی اور گھر کی چار دیواری میں مقید 'خاتونِ خانہ' کی حیثیت سے عورتوں کی زندگی کو اس معاشرے کی روشنی میں پیش کیا جاتا تھا۔ ایسے میں ڈاکٹر رشید جہاں اردو فکشن میں 'انگارے' کے توسط سے داخل ہوئیں اور اپنی بامقصد اور اصلاحی تحریروں کے ذریعے عورتوں کے مسائل کے تعلق سے سماج پر کڑی تنقید کی اور اصلاح کی راہ دکھانے کی کوشش کی۔ اس اعتبار سے وہ اس معاشرے کی پہلی مصور ہیں مگر عصمت نے نہ صرف انگارے سے ایک قدم آگے بڑھ کر اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا بلکہ عورتوں کے مسائل، اس کے دبے کچلے ارمان، جنسی خواہشات نفسیاتی کشمکش اور آزادی کو نہ صرف اجاگر کیا بلکہ مردوں کے بنائے ہوئے معاشرے میں ایک ہیجان برپا کر دیا اور اسے نئے طرز پر سوچنے کی راہ دکھائی۔ بقول محمد حسن:

> ''عصمت کے افسانوں نے سوال اٹھایا مرد اور عورت کی برابری کا اور یہ برابری محض گھر کے اندر کی برابری نہ تھی بلکہ جذبے اور فکر کی سطح پر تھی۔ اگر نوجوان باغی ہو سکتے ہیں اور عشق و محبت کے سرمدی نغمے گانے کے بجائے اسے تمام زندگی کی سطح پر لاسکتے ہیں اور سیدھی سادی جنسی جذباتیت کی باتیں کر سکتے ہیں تو کیا یہ اجازت عورت کو نہیں دی جاسکتی۔''

(پروفیسر محمد حسن، 'عصمت چغتائی ایک روشن خیال خاتون'، ماہنامہ آجکل، نئی دہلی، جنوری 1922، ص:12)

عصمت کا عقیدہ تھا کہ عورت کی پستی کے دو بنیادی اسباب ہیں۔ اول یہ کہ ناخواندہ ہے اس لیے اسے اپنے حقوق کا علم نہیں۔ اگر وہ احتجاج بھی کرتی ہے تو اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ دوسرے اقتصادی طور پر وہ مرد کی غلام ہے جب تک وہ اپنے پیروں پر کھڑی نہیں ہو جاتی تب تک اس کی حالت میں تبدیلی ناممکن ہے اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے افسانوں اور ناولوں میں ذاتی تجربات و مشاہدات کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے عہد کے معاشرے میں عورت کی حیثیت، اس کے مسائل، اس کے دبے کچلے ارمانوں اور محرومیوں کو پیش کیا۔ مردوں کے اس غلبے والے سماج میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ انھوں نے ذاتی تجربے سے اپنے مسلم سماج کو پہچانا تھا اور اس کے برخلاف ہمیشہ سماج سے بغاوت کی اور اپنی آخری سانس تک وہ 'اینگری وومن' ہی بنی رہیں۔

عصمت چغتائی نے عورتوں کے سماجی استحصال، ان کی لاچاری و مجبوری اور سماجی حیثیت سے متعلق بہت سے افسانے لکھے اور عورت کے وقار کو اوپر اٹھایا۔ مثلاً عصمت کا افسانہ ''چوتھی کا جوڑا'' ہمارے معاشرے میں پھیلی ہوئی جہیز جیسی لعنت سے پیدا شدہ درد و کرب کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ اس افسانے میں مسلم متوسط طبقے کی لڑکیوں کے شادی بیاہ کے مسائل کو بڑے موثر اور فنکارانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ یہ مسئلہ اعلیٰ طبقے کے لیے تو کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا لیکن متوسط طبقہ اور ادنیٰ طبقہ کے لیے یہ بہت بڑا مسئلہ ہے کیوں کہ جہیز کی رقم نہ ہونے کی وجہ سے والدین اپنی لڑکیوں کی شادی نہیں کر پاتے ہیں اور انھیں کافی عمر تک بیٹھے رہنا پڑتا ہے۔ پھر عمر زیادہ ہو جانے کی وجہ سے لڑکے والے کے مطالبات میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے شادیاں نہیں ہو پاتی ہیں یا ہوتی بھی ہیں تو پھر لڑکے لڑکی کا کوئی میل نہیں رہ جاتا ہے۔ مجبور ہو کر والدین کو اپنی نوجوان لڑکی کی شادی بوڑھے شخص سے کرنی پڑتی ہے۔ یہ مسئلہ صرف ایک گھر یا خاندان کا نہیں بلکہ ہندوستان کے کچھ مسلم گھرانوں بالخصوص متوسط طبقے کے خاندان کا المیہ ہے۔ عصمت کا یہ افسانہ انہی برائیوں کی عکاسی کرتا ہے۔ بقول وقار عظیم:

> ''چوتھی کا جوڑا'' میں ایک لڑکی کی معمولی سی کہانی میں عصمت نے ایک معاشرے اور ایک تہذیب کا سارا درد اور اس درد کی ساری ٹیسیں بھر دی ہیں۔ اور اس درد اور اس کی ٹیسوں کے بیان میں جہاں ایک طرف ان ساری تفصیلوں سے کام لیا ہے جو کسی ماحول کی مصوری کا لازمی جزو ہیں اور دوسری طرف بیان میں غزل کی لطافت اور ایمائیت بھی موجود ہے۔''

(وقار عظیم، نیا افسانہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس 1982، ص 214)

عصمت کا یہ افسانہ اپنے اندر بڑا کرب اور درد سموئے ہوئے

ہے۔معاشرے میں پھیلی جہیز کی اس لعنت نے نہ جانے کتنی ارمانوں اور حسرتوں بھری زندگی کوموت کے گھاٹ اتار دیا۔لیکن عصمت نے سماج کے اس ناسور کوایک باشعوراور روشن خیال عورت کی حیثیت سے ہی نہیں بلکہ ایک مہذب معاشرے کے فرد کی حیثیت سے محسوس کیا اور اسے اپنی تخلیقات میں اجاگر کرنے کی کوشش کی۔

کہانی ''سونے کا انڈا'' میں بھی عصمت نے جہیز کے مسئلے کو اجاگر کیا ہے۔یہاں بھی جہیز کی بڑھتی ہوئی لعنت کے سبب بیٹیاں والدین پر کتنی بوجھ بن چکی ہیں اوران کا وجود کتنا ناقابل برداشت ہو چکا ہے کہ بیٹی کی پیدائش کے دن سے ہی ان پر ایک خوف طاری ہو جاتا ہے۔''سونے کا انڈا'' میں اسی صورت حال کی منظر کشی کی گئی ہے۔ بندو میاں کے یہاں جب یکے بعد دیگرے تین لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں تب ان کی ماں اپنا ردعمل برداشت نہیں کر پاتیں۔

''خدا کی مار پڑے ان حرام زادیوں پر، نگوڑیوں نے بندو میاں کا ہی گھر دیکھ لیا ہے۔سہ دری سے پڑوسن بولی۔دہلیز پر بندو میاں کی ماں پھسکڑا مارے بیٹھی نکمی بہو کی سات پشت کو گالیاں دے رہی تھی۔موئی ہجڑوں کے خاندان کی لونڈیاں نہ جنے گی تو اور کیا کرے گی۔''

(عصمت چغتائی، افسانہ سونے کا انڈا، 'چھوئی موئی' کتب پبلشرز لمیٹڈ 1947، ص:178)

ہمارے معاشرے میں بے جوڑ شادی کا مسئلہ بھی بہت اہم ہے۔ لڑکوں کو اپنی پسند ناپسند کا پورا پورا اختیار ہے لیکن لڑکیوں کے لیے زبان کھولنے کی گنجائش نہیں ہے۔ ماں باپ جہاں بھی چاہیں شادی کر دیں خواہ ان دونوں میں کوئی ذہنی، علمی اور مزاجی ہم آہنگی ہو یا نہ ہو۔ان بے جوڑ شادی کا اثر پورے سماج پر پڑتا ہے۔خانگی زندگی عام طور پر خراب ہو جاتی ہے۔

عصمت کا افسانہ ''لحاف'' بھی اسی حقیقت کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔'لحاف' کی تخلیق کا اصل مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی نوجوان عورت ایسے شوہر کے پلے باندھ دی جائے جو جنسی اعتبار سے محروم ہو یا اس کا رجحان کسی اور طرف ہو تو ویسی صورت میں ایک عورت اپنی زندگی کس طرح گزارتی ہے اور جنسی جذبات کی تسکین کے لیے کون سی راہ اختیار کرتی ہے۔بقول وقار عظیم:

''عصمت کا بڑا اضافہ یہ ہے کہ انھوں نے ہمیں بتایا کہ عورت کے بھی اپنے مسائل ہیں۔''

(وقار عظیم، 'نقوش' (افسانہ نمبر) اردو افسانے میں روایت اور تجربے۔ لاہور 1954، ص:1039)

جس زمانے میں یہ افسانہ لکھا گیا اس وقت ہم جنسیت کا موضوع شجر ممنوعہ کی حیثیت رکھتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ اس پر فحاشی کے الزام بھی لگے لیکن عصمت کی جرأت اور بے باکی یہ ہے کہ انھوں نے اتنے نازک مسئلوں کو اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا اور حقیقت نگاری کی ایک نئی راہ قائم کی۔ش۔ اختر، عصمت کے افسانے کی بھرپور تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چونکہ وہ خود بھی عورت ہیں اس لئے اس سلسلے میں ان کے مشاہدات پر شک نہیں کرنا چاہئے۔انھوں نے عورت کی جنسی خواہشات کے اس عملی روپ کو ایک ڈاکٹر کی نظر سے دیکھا۔ اس میں لذت اندوزی فحاشی کا کوئی عنصر نہیں ہے۔ یہ بذات خود ایک بڑی صحت مند چیز ہے۔ کوئی موضوع اپنے طور پر فحش اور غیر فحش نہیں ہوتا۔فن کار کا اس موضوع کے ساتھ کیا Treatment ہے؟ مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ عصمت نے جنسی حقیقت نگاری کی جتنی تصویریں کھینچی ہیں سبھوں میں 'لحاف' کی جنسی حقیقت نگاری اپنی ایک منفرد راہ بناتی ہے۔''

(ش۔اختر، 'اردو افسانوں میں لس بین ازم'۔ ہند لیتھو پریس، میکلوڈ گنج، گیا، 1977، ص:90)

عصمت کا افسانہ ''گیندا'' ایک ایسا افسانہ ہے جو عرصۂ دراز تک زندہ رہے گا۔ عصمت کی یہ سادہ سی کہانی ہمعصر معاشرے کی عورت کے حوالے سے اس قدر رنج وغم اور حسرت و یاس کے جذبات سے لبریز ہے کہ قاری دیر تک کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ کہانی ہمارے معاشرے کے ایک گھناؤنے پہلو کو نمایاں کرتی ہے، جس میں ایک غریب اور بے بس معصوم بچی کا جنسی استحصال اس قدر ڈھکے چھپے انداز میں ہوتا ہے کہ کسی کو پتہ بھی نہیں چلتا۔ 'گیندا' ایک تیرہ چودہ سال کی معصوم بچی کی کہانی ہے جو ایک کھاتے پیتے گھرانے میں نوکرانی (بحیثیت استری کرنے کا کام) کرتی ہے۔ اس کی شادی کم سنی میں ہی ہو گئی تھی لیکن چند ماہ بعد اس کا شوہر چل بستا ہے اور سماج کی نظروں میں وہ بیوہ کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اب اس کے لیے آرائش و زیبائش کرنا ہاتھ میں چوڑیاں پہننا، ماتھے پر بندیاں لگانا، مانگ میں سندور بھرنا، یہ سب اس کے لیے ممنوع ہو چکا تھا۔ لیکن مالک کا لڑکا اس کو اپنی ہوس کا شکار بناتا ہے اور کسی طرح اسے بہلا پھسلا کر اس کی غربت، بے بسی اور بیوگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے اپنی تسکین کا ذریعہ بناتا ہے۔ جب گھر والوں کو اس بات کا پورا یقین ہو گیا کہ اس نوکرانی کے پیٹ میں صاحبزادے کا بچہ ہے تو آئے دن 'گیندا' کی پٹائی ہوتی اور اسے فاقہ کشی پر مجبور کیا جاتا تا کہ وہ مر جائے اور صاحبزادے اور گھر والوں کو نجات مل جائے۔ لیکن وہ بہت ہی سخت جان تھی۔ اس پر جو بھی ظلم وستم ڈھایا جاتا اسے سہہ لیتی اور جب ننھا سا للو وجود میں آیا تو بہو ہر وقت اس معصوم بچے کو کوستی رہتی لیکن 'گیندا' کی محبت دیکھئے کہ ایک کالا سا ڈورا اس کے پاؤں میں باندھ دیا تا کہ وہ نظر بد سے بچا رہے۔

اس کہانی میں نہ صرف غریبی اور امیری کی تفریق دکھائی گئی ہے بلکہ معاشرہ میں مرد کی بالادستی اور عورت کی زبوں حالی کی ایک سنگین حقیقت ہے۔ وہ لڑکا گیندا کا بے باکی سے استحصال بھی کرتا ہے اور بچ بھی جاتا ہے۔ گھر کے تمام افراد بھی اس کے پیچھے ہیں لیکن معاشرے میں گیندا کی حیثیت ایک نیچ اور بدکار کی ہے جو ایک شریف زادے کو خواہ مخواہ بدنام کرنے پر تلی ہوئی ہے۔

عصمت کا افسانہ ''بیکار'' بھی معاشرے میں پردے کی بے جا پابندیوں، عورت کا گھر سے باہر نکلنا، اس کا نوکری کرنا، مردوں کے شانہ بہ شانہ چلنا اور اس پر سماج کا آوازیں کسنا، ان تمام موضوعات کو اس میں پیش کیا گیا ہے۔ آزادی ملنے اور مساویانہ حقوق حاصل ہو جانے کے بعد بھی کافی عرصہ تک عورتوں کی بے پردگی اور ان کے گھروں سے باہر نکلنے اور ملازمت کرنے کے عمل کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ آج بھی کچھ خاندانوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جہاں لڑکی کی تعلیم، ان کا ملازمت کرنا، ان کا بے پردہ باہر نکلنا معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اس افسانے کے کردار ہاجرہ اور باقر میاں اسی عتاب کے شکار ہیں۔ عصمت کے متعدد افسانوں میں متوسط طبقے کی مالی پریشانیوں کا ذکر ہے۔ بیکار میں بھی انھوں نے اسی موضوع کا انتخاب کیا ہے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسائل کو بیان کیا ہے۔

عصمت چغتائی نے اپنے 53 سالہ ادبی زندگی میں بے شمار افسانے، ناول، ڈرامے، فلمی کہانیاں اور مکالمے لکھے مگر لکھنے کے سلسلے میں اپنے ایک ہی نقطۂ نظر کو اپنائے رکھا اور متوسط طبقہ کے مسلمان گھرانوں اور مسلمان زمیندار کنبوں کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالی جس سے ان کی شان و شوکت اور عظمت کی پول کھلتی تھی اور خاص کر انھوں نے اونچے طبقے کے دوہرے معیار والی زندگی کی ریاکاری کا پردہ فاش کیا۔ عصمت نے اپنی تحریروں کے ذریعے ہمیشہ مرد کے مقابلے میں عورت کی وکالت کی۔ انھوں نے ہر بیوی کو اپنے شوہر کی کنیز یا باندی نہ بننے کے لیے اکسایا اور عورت کو آگاہ کیا کہ وہ مرد کی جنسی خواہشات کے لیے کھلونا نہ بنے۔ عصمت کو ہمیشہ اس بات سے چڑھ رہی کہ شوہر کو بیوی کا مجازی خدا قرار دیا جائے۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ عصمت چغتائی نے ہمعصر معاشرے کی عورت اور اس کی سماجی حیثیت کو نہ صرف اپنی تخلیقات کا موضوع بنایا بلکہ سماج کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ عورت بھی اس سماج کی ایک اہم اکائی ہے۔ انھوں نے عورت کو گھر کی چہار دیواری میں مقید کر کے نہیں دیکھا۔ بلکہ عورت کو کائنات کے تمام کاموں میں مردوں کے شانہ بشانہ قدم سے قدم ملا کر چلنے والی عورت کے روپ میں دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے عورتوں پر ہونے والے ظلم وستم، عورتوں کے ساتھ سماج کا سوتیلا رویہ اور ان کے استحصال کا منظر ہمارے سامنے پیش کیا۔ گرچہ ان کی تحریروں پر ہنگامے بھی ہوئے، ان پر فحش نگاری کا الزام بھی عائد ہوا لیکن عصمت نے جو کچھ بھی لکھا، اپنے ماحول اور معاشرے کے بارے میں لکھا، جو کچھ دیکھا اور محسوس کیا اس کی ہو بہو تصویر پیش کی۔

□□□

Dr. Shabnam Ara
House No. 128, Flat No. 303
Gali No. 10, Zakir Nagar
New Delhi-110025

ڈاکٹر نغمہ پروین

اردو غزل کی نسائی آوازیں

غزل اردو شاعری کی سب سے جاندار اور مقبول صنف ہے۔ گزشتہ نصف صدی میں اس صنف میں جس تنوع اور توانائی کے ساتھ مستحکم تجربے کیے گئے ہیں وہ اُس کی مقبولیت کی علامت ہیں۔ غزل کبھی حسن و جمال اور جذب واحساس کی آواز رہی تو کبھی ترقی پسندی کے سرخ لبادے میں بھی، کبھی جدیدیت کے طوق وسلاسل میں جکڑی کبھی سیاسی احتجاج ونعرہ زنی کی کرخت آوازوں میں گھری پھر بھی غزل کی مقبولیت برقرار رہی اور ہر رنگ میں سرسبز وشاداب رہی، کلاسیکی اور نوکلاسیکی شاعروں نے خون جگر کی تراوشوں سے اُس کے حسن کو تروتازہ رکھا۔

نثری ادب کے مقابلے میں اگر دیکھا جائے تو شعری ادب یعنی شاعری میں خواتین کا حصہ بہ نسبت مردوں کے بہت کم ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی کہ ایک زمانے میں خواتین کا حصول علم کے لیے بھی گھر سے نکلنا معیوب سمجھا جاتا تھا اور شعروشاعری تو بالکل ہی ناپسندیدہ چیز سمجھی جاتی تھی، لیکن پھر بھی بہت سے ادبی گھرانوں میں زیادہ تر خواتین نعت، منقبت رثائی ادب میں ہاتھ آزما کر اپنی تسکین کرلیا کرتی تھیں۔ پچاس کی دہائی کے بعد کچھ تبدیلیاں نمایاں ہوئیں اور خواتین میں حصول علم کی گنجائش نکلی تو پھر اردو میں خواتین شاعرات بھی سامنے آئیں اور ان کی تعداد میں اضافہ ہوا لب ولہجہ میں بھی تبدیلی آئی اور ان کی تخلیقات رسالوں اور اخباروں کے علاوہ مشاعروں کے اسٹیج پر بھی مقبولیت حاصل کرنے لگیں۔ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک صورتِ حال یہ تھی کہ عورت کو نفی ذات کا سامنا تھا، وہ اپنی ذات کا اثبات بھی نہیں کر پا رہی تھی۔ اس کا اظہار بھی مرد کی مرضی اور منشا کے تابع تھا۔ تانیثی نقاد نگار ڈاکٹر شہناز نبی لکھتی ہیں:

’’ خواتین قلم کاروں کو دو مورچوں پہ جنگ لڑنا پڑی۔
ایک مردوں کے بنائے ہوئے اصولوں کے خلاف،
دوسری عورتوں کی اس کھیپ سے جو خود عورتوں کی آزادی

کے خلاف تھیں“۔

اردو غزل نے جب سے آنکھیں کھولی ہیں تب سے آج کے زمانہ تک وہ ہر دلعزیز صنف سخن بنی ہوئی ہے۔ بادشاہوں اور عوام کے درمیان پرورش پانے کے بعد آج کے دور میں بھی پوری تابنا کی سے دلوں کو مسحور اور ضمیروں کو جھنجھوڑ رہی ہے۔ کسی بھی صنف کی مقبولیت کی اس سے بڑی مثال کیا ہوگی کہ وہ مسلسل کئی صدیوں سے ہر عام وخاص کے دلوں پر راج کرے۔ یہ وہ صنف ہے جس سے اردو زبان کا حسن کل بھی تھا اور آج بھی ہے۔

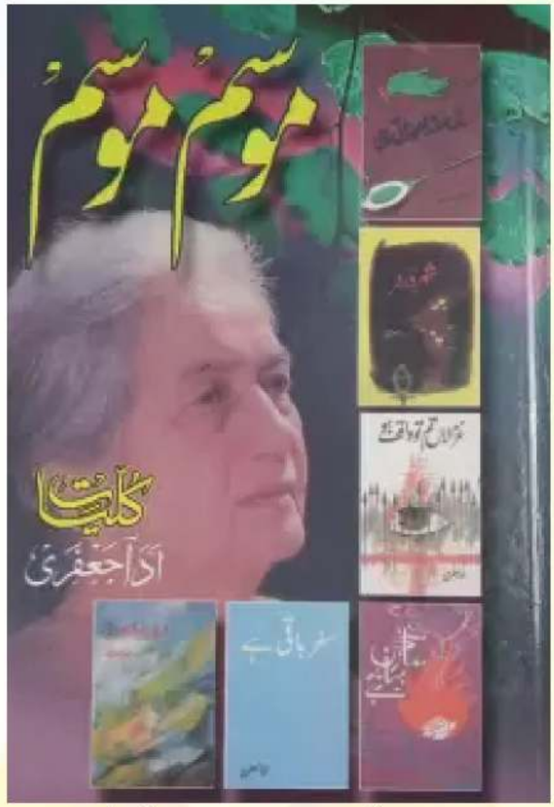

بیسویں صدی کی چند معروف شاعرات میں کچھ ایسی شاعرات گزری ہیں، جنھوں نے اردو غزل کو مستحکم بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ ان شاعرات کی وجہ سے اردو غزل کو نئی وسعتوں سے ہم کنار ہونے کے مواقع ملے۔ ان کی کارگزاریوں کو اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکے گا۔

پنہاں بریلوی کا اصل نام رابعہ خاتون تھا جو کہ سہارنپور میں پیدا ہوئیں۔ پنہاں نے ابتدا میں فارسی میں کلام کہا لیکن بعد میں اردو کی طرف مائل ہوگئیں۔ اسی طرح پہلے غزلیں کہیں اور بعد میں نظموں اور یہاں تک کہ افسانوں میں بھی طبع آزمائی کی اور اس وقت کے رسائل میں اپنی خاص پہچان بنائی۔ یوں تو انھوں نے مختلف اصناف میں کلام کہا لیکن غزل اور نظم سے انھیں دلی وابستگی تھی۔ نمونہ کلام ملاحظہ فرمائیں:

زندگی سچ کی حمایت نہیں کرنے دیتی
ایسی کوئی بھی عبادت نہیں کرنے دیتی
مصلحت عقل سے کہتی ہے کہ اک حد میں رہو
اور دل کو بھی شرارت کرنے نہیں دیتی

جفا و ناز کی خوگر ہوں پنہاں
خدا معلوم ہے رسم وفا کیا

”بیسویں صدی کی چند معروف شاعرات میں کچھ ایسی شاعرات گزری ہیں، جنھوں نے اردو غزل کو مستحکم بنانے میں اہم رول ادا کیا۔ ان شاعرات کی وجہ سے اردو غزل کو نئی وسعتوں سے ہم کنار ہونے کے مواقع ملے۔ ان کی کار گزاریوں کو اردو ادب کبھی فراموش نہیں کر سکے گا“

پنہاں بریلوی اردو کی ایک عمدہ شاعرہ ہیں۔ مذکورہ بالا اشعار میں تانیثی لہجے کا پتہ ضرور چلتا ہے۔ ان کی غزلوں میں نسوانی جذبات کی عکاسی بھی خوشگوار انداز میں ملتی ہے۔

ادا جعفری جدید شاعری کا ایک اہم نام ہے۔ ادا جعفری کی پیدائش بدایوں (ہندوستان) میں ہوئیں لیکن ہوا کے نامعقول جھونکے اڑا کر ان کو پاکستان لے گئے۔ اس لیے ان کی شاعری میں تانیثی جذبات، خوشی وغم کے ساتھ ساتھ ہجرت کا کرب بھی صاف نظر آتا ہے۔

ہونٹوں پہ کبھی ان کے مرا نام ہی آئے
آئے تو سہی بر سر الزام ہی آئے

ہمارے شہر کے لوگوں کا اب احوال اتنا ہے
کبھی اخبار پڑھ لینا کبھی اخبار ہو جانا

اردو غزل زمانے کے نشیب وفراز سے دوچار ہو کر بہت تیزی

سے تبدیل ہو رہی تھی، ایسے دور میں شاعروں کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہو کر ادا نے نہ صرف شاعرات کی نمائندگی کی بلکہ مرد اساس ادبی معاشرے میں اپنا وجود بھی تسلیم کرا لیا۔ اس طرح انھوں نے اردو غزل کی سمت و رفتار متعین کرنے میں اہم رول ادا کیا۔

اردو غزل کو مستحکم بنانے میں پروین شاکر کا اہم رول رہا ہے۔ محبوب کو ٹوٹ کر چاہنے والے احساسات ان کی غزلوں میں جا بجا ملتے ہیں۔ ان کی غزلوں کا محور ان کا محبوب ہی رہا ہے۔ انھوں نے اپنے پہلے شعری مجموعہ "خوشبو" میں نوعمر لڑکیوں کے جذبات کی عکاسی کی ہے۔ ان کی شاعری کا بغور مطالعہ کرنے پر سوز و گداز بھی نظر آتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے رنج و غم کو ظاہر ہی نہیں کرنا چاہتی ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ ٹھیک لگتا ہے کہ ان کے کلام میں ایک ایسی کسک پائی جاتی ہے، جو قاری کے تجسس کو بڑھاتے ہوئے ان کی غزلوں کی طرف مائل کر دیتی ہے۔ پروین شاکر کی غزلوں میں فطرت کی شمولیت بالکل فطری لگتی ہے اور ایک ایسی فضا پیدا ہو جاتی ہے، جس میں خوش گوار لمحے، فکر، غم و اندوہ سب ایک ہی رنگ میں ڈوبے نظر آتے ہیں۔

غزل ایک ایسی مستحکم اور بلند دیوار بن چکی ہے، جس کے سہارے آج کے ادیب اور شاعر اپنی صلاحیتوں کی بیل چڑھا کر خود کو روشناس کرانے میں مصروف ہیں۔ اپنے حالات اور ماحول کے پس منظر میں جب وہ اپنے جذبات و محسوسات کو الفاظ عطا کرتے ہیں تو شعر وجود میں آتا ہے۔ پروین شاکر کی غزلوں میں انتہا پسندی نہیں ملتی بلکہ وہ تو اپنی تنہائی کو غزلوں میں پیش کرتی ہیں۔ ان کی غزلوں سے چند متفرق اشعار ملاحظہ فرمائیں:

کانپ اٹھتی ہوں میں یہ سوچ کے تنہائی میں
مرے چہرے پہ ترا نام نہ پڑھ لے کوئی
وہ تو خوشبو ہے ہواؤں میں بکھر جائے گا
مسئلہ پھول کا ہے پھول کدھر جائے گا

مذکورہ بالا اشعار کے پہلے شعر میں عورت کی تہہ داری کا مضمون قلمبند کیا گیا ہے۔ دوسرے شعر میں مرد کو خوشبو کہنا اور عورت کو پھول کہنا نادر اور سماجی سیاق رکھنے والا عمدہ استعارہ ہے۔ پروین کی غزلوں کی عورت جو اپنی سوتن کو از خود دلہن بناتی نظر آتی ہے اس کی وجہ کچھ اور نہیں بلکہ وہ تانیثی شعور ہے جہاں عورت مرد کے بغیر بھی زندہ رہنے کا وسیلہ ڈھونڈ سکتی ہے:

ضبط اتنا بھی نہ کر احساس مرجھا جائے گا
سرخ گالوں کا چمکتا رنگ زردا جائے گا

عورت کی عزت و آبرو کا انہیں بہت پاس و لحاظ ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی غزلیں اور نظمیں دونوں ہی نسائی مسائل سے بھرپور ہیں۔ ان کا نسائی شعور حد درجہ بیدار نظر آتا ہے۔

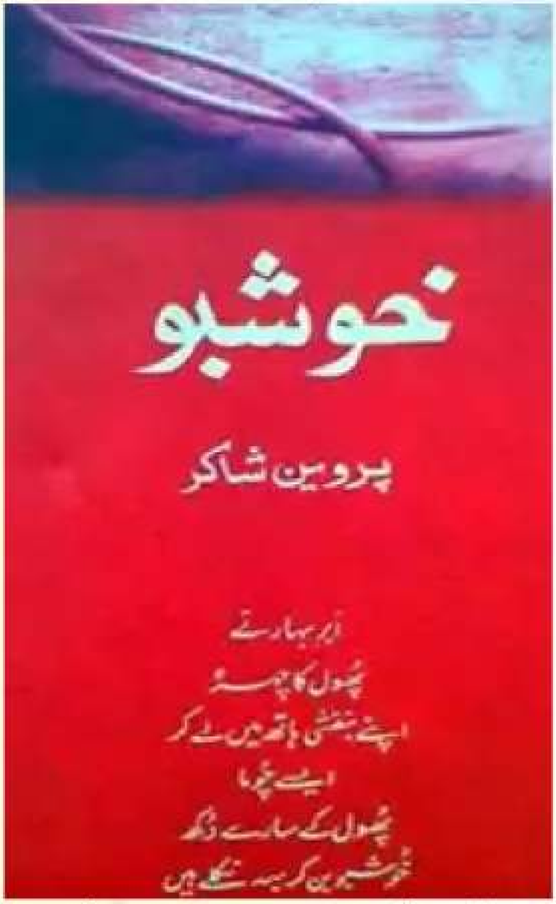

کشور ناہید کی شاعری اس حوالے سے اہم ہے کہ ان کی شاعری صرف عورت کی شاعری نہیں بلکہ اس عورت کی شاعری ہے جسے عورت کے حقوق کا علم ہے اور وہ ان حقوق کی حق تلفی پہ آواز اٹھائے۔ کشور ناہید کی شاعری میں مساویت کا تصور ہے۔ وہ کبھی بھی شوہر کو حاکم اور بیوی کو محکوم ماننے کو تیار نہیں ہوتیں، ان کے نزدیک دونوں کو ایک دوسرے کا خیر خواہ اور دوست ہونا چاہیے۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

یہ سر شام آفتاب اداس
کوئی لڑکی کہیں اکیلی ہے
پہچان اپنی ہو تو ملے منزل مراد
ناہید گاہے گاہے سہی، آئینہ تو دیکھ

کشور ناہید کی غزلیں تانیثی شعور سے مملو ہیں، وہ جانتی ہیں کہ جبر کا

شکار ہوکر بھی صرف عورت ہی معاشرتی ناہمواریوں پہ نوحہ کناں ہے:

میں ایک ہاتھ سے دیوار کیسے تھاموں گی
لہو میں غرق ہے دست دعا نیام تلک

ان کی غزلوں میں تنوع دیکھنے کو ملتا ہے۔ انھوں نے روایتی شاعری سے ہٹ کر شاعری کی ہے اور شاعری میں وہ عورت کے حقوق پر زور دیتی نظر آتی ہیں۔ کہیں کہیں ان کی شاعری میں باغیانہ لہجہ بھی دیکھنے کو ملتا ہے:

بیٹھی ہوں راہ میں کسی تصویر کی طرح
وہ بھی کبھی تو آئے گا رہگیر کی طرح

ترقی پسند، جدیدیت، مابعد جدیدیت اور تانیثیت جیسے کئی مختلف ادوار سے اردو غزل دوچار ہوتی رہی اور شاعرات نے ہر دور میں اپنی صلاحیت اور ہنر مندی کا مظاہرہ کیا۔ صبر، مظلومیت، انسان دوستی، سماجیات، اخلاقیات، فکر وفلسفہ جیسے ہر طرح کے موضوعات غزلوں میں پیش کیے اور اردو غزل کا دامن وسیع کیا۔ اپنے اندرونی کرب، خوشی، دلی کیفیت، احساسات اور جذبات کو بڑی ہی خوش اسلوبی سے پیش کیا۔ یہ صرف ان کا ہنر ہی نہیں بلکہ دلیری اور عظمت کی نشانی ہے، جسے مرد اساس ماحول میں ظاہر کرنا آسان نہیں تھا۔

اس طرح دیکھا جائے تو خواتین نے ادب میں مردوں کے بعد قدم رکھا۔ اردو ادب میں خواتین بیسویں صدی کے آخری دہائی میں رونما ہوئیں اور شاعری کو اظہار خیال کا وسیلہ بنایا، اور دیکھتے ہی دیکھتے شعری منظر نامے پر کئی ایسی شاعرات کا نام ابھر کر سامنے آیا جنھوں نے نہ صرف صنفِ غزل کو اظہار خیال کا وسیلہ بنایا بلکہ صنفِ نظم میں بھی طبع آزمائی کی۔ ایسی شاعرات میں شاہدہ حسن، فہمیدہ ریاض، سارہ شگفتہ، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی، زہرا نگاہ، عزیز بانو اور شہناز نبی وغیرہ نے اپنے اپنے اعتبار سے غزل کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے اور ابھی بھی اردو دنیا کی مزید توقعات ان شاعرات سے وابستہ ہیں۔ ان شاعرات کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

پتھر سے وصال مانگتی ہوں
میں آدمیوں سے کٹ گئی ہوں

(فہمیدہ ریاض)

سانحہ ہوکے رہا چشم کا مرجھانا
خواب لگتا ہے تیرا خواب میں بھی آ جانا

(شاہدہ حسن)

بظاہر تو بدن بھر کا علاقہ گھیر رکھا ہے
مگر اندر سے ہم نے شہر سارا گھیر رکھا ہے

(سارہ شگفتہ)

مارا ہمیں اس دور کی آساں طلبی نے
کچھ اور تھے اس دور میں جینے کے قرینے

(زاہدہ زیدی)

کشت ویراں کی طرح تشنہ رہی رات مری
لوٹ آئی تیرے در سے بھی مناجات مری

(ساجدہ زیدی)

اس امید پہ روز چراغ جلاتے ہیں
آنے والے برسوں بعد بھی آتے ہیں

(زہرا نگاہ)

میرے ماتھے کی لکیروں میں اضافہ کرکے
وہ بھی ماضی کی طرح اپنی نشانی دے گا

(عزیز بانو)

کوئی ہے اپنے سوا بھی مسافت شب میں
سحر جو ہو تو کھلے راز خوش قیاسی کا

(شہناز نبی)

مذکورہ بالا تمام شاعرات اپنے تجربات کو سہل انداز میں پیش کرنے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ ان کی نسائی آواز کی کارفرمائی بلا کسی رکاوٹ اور بندش کے دکھائی دیتی ہے اور اب وہ مردوں کی زبان میں اپنے احساس وفکر کی ترجمانی نہیں کرتیں بلکہ خود اپنی آواز کے ذریعے اپنی شناخت قائم کر چکی ہیں۔

زیر نظر مضمون سے جو نتائج برآمد ہوتے ہیں ان کی مدد سے یہ کہنا آسان ہوگا کہ بیسویں صدی کی شروعات میں غزل گو شاعرات نے ایک مدھم آواز کے ساتھ شروعات کی تھی وہی آواز وقت کے ساتھ ساتھ مزید بلند ہوتی گئی۔ اس بلند آواز نے اردو غزل کو نہ صرف متفرق موضوعات دیئے بلکہ اردو غزل کو مستحکم بنا کر وقت کے ساتھ چلنا بھی سکھایا۔

□□□

Dr. Nagma Parveen

House.No. 280, Hatthi Madari,

Behind Muslim Inter College,

Mau Nath Bhanjan (Mau)- 275101 (U.P)

ڈاکٹر تسنیم فاطمہ

مغرب میں اردو افسانے کا آغاز

مغربی ممالک میں ہندوستانی قلمکاروں اور ادب شناسوں کی آمد ویسے تو بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں ہی شروع ہو چکی تھی مگر یہ سلسلہ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے بعد تیز سے تیز تر ہوتا گیا۔ ملک راج آنند، سجاد ظہیر اور ان کے دوسرے ترقی پسند رفقا مغرب کے مستقل باشی نہ سہی مگر یہاں مغرب کے قیام کے اثرات موجود ہیں۔ اگر ہم سجاد ظہیر اور ملک راج آنند کی کہانیوں کو دیکھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں مغرب کے طرز معاشرت سے زیادہ وہاں کا طرز فکر موجود ہے۔ اس کے مقابلے میں کرشن چندر کے بعض ناولوں یا افسانوں میں مغربی طرز زندگی کی ایسی سچی تصویریں ملتی ہیں جن کو دیکھ کر یہ کہنے کا واقعی دل چاہتا ہے کہ "یہ چاند سورج بھی ہیں ہمارے" اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مغرب کے زیر اثر لکھے جانے والے ایسے افسانوں کی روایت جو مغرب کی کسی نہ کسی طور پر آئینہ داری بھی کرتے ہوں برصغیر میں افسانہ نگاری کے آغاز سے کم و بیش تیس برس بعد شروع ہوتی ہے۔ یہ وقفہ اس اعتبار سے بہت زیادہ نہیں کہا جا سکتا کہ پریم چند سے قبل ہمارے یہاں بھی اردو افسانہ بس اپنے بال و پر ہی نکال سکا تھا اور اسے نہ تو کوئی وسیع فضا میسر تھی نہ میدان۔

بہر حال مغرب میں اردو افسانہ نگاری کا آغاز جن لوگوں نے باضابطہ کیا وہ تارکین وطن ہی تھے جو برصغیر کے مختلف ملکوں سے ہجرت کر کے لندن اور اس کے بعد یورپ کے مختلف ملکوں میں آباد ہوتے گئے تھے پھر یہ قافلہ اور اس سے الگ دوسرے قافلے بھی روانہ ہوئے جن کی منزل یورپ نہیں امریکہ تھی۔ وہاں بھی 1905 سے 1960 کے دوران قائم شدہ افسانہ نگاری کی روایت کے زیر اثر کہانیاں لکھی گئیں اور آگے چل کر 1960 کے بعد کی روایت کو بھی موضوعاتی اور اسلوبیاتی سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی۔ یہاں اس نکتے کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے کہ جہاں تک مغرب میں اردو نثر نگاری کے آغاز کا سوال ہے اس کا سلسلہ بہر صورت افسانہ نگاری سے قدیم ہے۔ یہی نہیں خود فکشن میں بھی دوسری اصناف پر طبع آزمائی ہوتی رہی ہے مگر افسانہ کی طرف توجہ بعد میں ہوئی۔ مثال کے طور پر تین ایسے قلمکاروں کا نام لیا جا سکتا ہے جو تارکین وطن میں سے نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق یورپ سے ہی ہے۔ میری مراد رالف رسل، ڈیوڈ میتھیوز اور کارلو کیولا سے ہے جن کا جنم کسی ایشیائی ملک میں نہیں ہوا بلکہ یورپ میں ہی ہوا ہے۔ ان تینوں نے اردو زبان و ادب کی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ یہاں تک کہ رالف رسل کو تو برطانیہ کا بابائے اردو ہی تسلیم کیا جاتا رہا ہے۔ مگر ان سبھوں کی خدمات کا دائرہ کار یا تو لسانیات اور علم زبان ہے یا پھر تحقیق و تنقید اور ترجمہ۔ یہیں پر شہرۂ آفاق ادیب عبداللہ حسین کا تذکرہ ضروری ہے جو اپنے ناول "اداس نسلیں" کے بعد بھی مسلسل فکشن کے چمن کی آبیاری میں مصروف رہے ہیں اور زندگی کے آخری ایام بھی برطانیہ کے ایک خوبصورت قصبے میں گزار رہے ہیں۔ گرچہ

انھوں نے ناولٹ بھی لکھے اور بالآخر انگریزی زبان کی طرف رجوع ہو گئے مگر ممکن ہے ان کی افسانہ نگاری کا کوئی نمونہ تحقیق کی روشنی میں سامنے آئے اور روایت کا حصہ بن سکے۔ مغرب میں اردو افسانے کے حوالے سے ایک اور نکتے کی طرف توجہ ضروری ہے۔ کچھ ایسے ادیب ہیں جو چند برس انگلینڈ یا کسی دوسرے مغربی ملک میں رہے اور ان کی تحریروں میں نہ صرف ان ممالک کا طرزِ معاشرت بلکہ طرزِ فکر بھی جلوہ گر ہے۔ ایسے لوگوں میں سجاد ظہیر اور ان کے رفقاء کے علاوہ غلام عباس، ضمیر الدین احمد، عزیز احمد اور ابن انشا کے نام بہ آسانی لیے جاسکتے ہیں۔ کرشن چندر کے یہاں بھی بعض خوبصورت افسانے مغرب خصوصاً لندن کے حوالے سے لکھے گئے ہیں جن میں روح عصر موجود ہے مگر یہاں ان سب کا تذکرہ چھوڑ کر محض ان لوگوں کی طرف توجہ کرنا بہتر ہے جو افسانہ نگاری سے وابستہ رہے ہیں۔

جیسا کہ میں نے ابتدا میں عرض کیا، مغرب میں اردو افسانے کی روایت ان تارکین وطن کی قلمی کاوشوں کا نتیجہ ہے جو ہجرت کر کے یورپ یا امریکہ گئے تھے۔ اس لیے مغرب میں اردو افسانے کی تاریخ برصغیر کے کم و بیش بیس، پچیس برس بعد شروع ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں ہماری نگاہ مختلف تاریخی شواہد کا جائزہ لیتی ہوئی جن میں افسانہ نگاروں کی تاریخ پیدائش بھی ایک پہلو ہے بالآخر چند ناموں پر ٹھہر جاتی ہے۔ یہ سبھی ایسے لوگ ہیں جو تقسیم اور آزادئ ہند سے قبل برصغیر کے کسی نہ کسی علاقے میں پیدا ہوئے اور براہ پاکستان یا براہ دہلی لندن یا کناڈا وغیرہ پہنچے۔ ان لوگوں میں سرفہرست اکرام بریلوی کو رکھا جاسکتا ہے جو 1918 میں پیدا ہوئے اور جن کی پہلی تخلیق 1938 میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ یہ ایک ڈرامہ خوفناک محبت ہے جو اختر شیرانی کے رسالہ رومان میں شائع ہوا تھا اس کے بعد ہندوستان کے مختلف رسائل مثلاً نیرنگ خیال، ادب لطیف، ادبی دنیا اور ساقی میں ان کی تحریریں شائع ہونے لگیں۔ ایک عرصے تک بلکہ ''فسانہ کہیں جسے'' کی اشاعت تک وہ فکشن رائٹر کی حیثیت سے تو مشہور رہے مگر ان کی افسانہ نگاری کا کوئی نمونہ دستیاب نہیں ہوسکا، یہ بھی عجیب بات رہی کہ وہ اردو کی تیسری بستی یعنی لندن میں نہ رہ کر کناڈا میں مقیم رہے اور ریٹائرمنٹ کے بعد وہیں بس گئے مگر ایک عرصے کے بعد مشہور شاعر عابد جعفری نے یہ انکشاف کیا کہ موصوف نے افسانے بھی لکھے ہیں سید عاشور کاظمی اس نکتے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''1992 میں جب میں ''فسانہ کہیں جسے'' پر کام کر رہا تھا اس وقت میں نے اپنی معلومات کو کافی نہیں سمجھا...... بار بار اکرام بریلوی صاحب کا نام سامنے آتا تھا اور ہر بار یہی پتہ چلتا تھا کہ اکرام بریلوی صاحب ناول لکھتے ہیں افسانہ نہیں لکھتے۔ برصغیر کی تقسیم سے پہلے ان کا جو ناول شائع ہوا تھا اس کا ذکر ہوا، ان کے ڈراموں کا ذکر ہوا، پل صراط کا ذکر ہوا مگر کسی گوشے سے یہ نہ معلوم ہوا کہ اکرام بریلوی نے افسانے بھی لکھے ہیں۔ ابھی کچھ دن ہوئے ٹورنٹو سے ممتاز شاعر عابد جعفری صاحب نے اکرام بریلوی صاحب کی تصانیف کی فہرست بھیجی اور یہ بھی بتایا کہ اکرام بریلوی صاحب کے افسانوں کے دو مجموعے ''تیز ہوا میں پتے'' اور ''تیسری نسل'' چھپ رہے ہیں۔ ناول سے افسانے تک وسعت سے اختصار کی سمت سفر اس بات کی دلیل ہے کہ علم بڑھ رہا ہے۔ لفظ و معنی پر گرفت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی جارہی ہے۔''

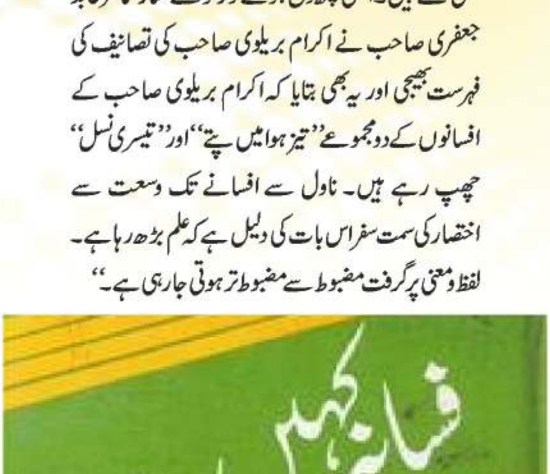

اس قطعی شہادت کے بعد اکرام بریلوی کو مغرب میں اردو افسانے کا ابتدائی نقطہ تسلیم کر لینے میں جھجک نہیں ہونی چاہیے۔ ان کے فوراً بعد کے لکھنے والوں میں عمر اور قدامت کے اعتبار سے مصطفیٰ کریم، کنول نین پرواز، شان الحق حقی، بیگم اختر جمال اور ہرچرن چاؤلہ کے نام آتے ہیں۔

شان الحق حقی اور کنول نین پرواز دونوں کے سن پیدائش میں صرف ایک برس کا فرق ہے، حقی 1925 میں پیدا ہوئے اور پرواز

1926 میں۔ چاؤلہ کا سن پیدائش بھی 1925 ہی تسلیم کیا جاتا ہے۔ حقی مستقل طور پر مانٹریال (کناڈا) میں مقیم رہے۔ انھوں نے تحقیقی وتنقیدی نوعیت کے کاموں میں شہرت پائی مگر اصل مقبولیت انھیں ''بھگوت گیتا'' کے ترجمے سے حاصل ہوئی۔ ان کی مطبوعہ کتابوں اور ترجموں کی مجموعی تعداد دو درجن سے زیادہ ہے مگر اسے اردو افسانے کی بدقسمتی ہی سمجھنا چاہیے کہ افسانوں کا صرف ایک مجموعہ ''شاخسانے'' (مطبوعہ 1991) اس فہرست میں موجود ہے۔ گرچہ ان کی پہلی کتاب انتخاب ظفر 1945 میں منظر عام پر آئی تھی۔ بہر حال اردو افسانہ نگاروں کے لیے یہ بھی کم باعث تقویت امر نہیں کہ شان الحق حقی جیسے اسکالر نے بھی افسانے لکھے ہیں۔ اب رہی بات کنول نین پرواز کی تو ان کا فکشن رائٹر ہونا ضرور تسلیم شدہ ہے مگر افسانوں سے متعلق بس ان کا یہ بیان نظر کے سامنے ہے کہ لندن آنے سے قبل انھوں نے جو افسانے اور مضامین اور ریڈیائی فیچر لکھے تھے، وہ سب ضائع ہو گئے ہیں، چونکہ یہ افسانے اور مضامین شائع شدہ تھے، اس لیے ان کی بازیابی کی طرف سے ناامید نہیں ہونا چاہیے۔ اس فہرست میں بیگم اختر جمال جیسی روشن خیال اور تعلیم یافتہ خاتون کا نام شامل رہنا اس کے مستند ہونے کی پہچان ہے۔ موصوفہ کا تعلق علم وادب کی بستی بھوپال کے ایک معزز اور ادبی خانوادے سے ہے، ان کے افسانوں کے چار مجموعے انگلیاں فگار اپنی (1971) ''زرد پتوں کا بن'' (دوسرا ایڈیشن 1981) سمجھوتہ ایکسپریس (1989) خلائی دور کی محبت (1991) کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے یہاں ترقی پسند فکر اور انسان دوستی نمایاں ہے، جس کا ایک سبب ان کے شوہر کی ہمہ وقت حوصلہ افزائی بھی ہے۔ اس فہرست میں ایک اور ہمہ جہت ادیب سدی مصطفیٰ کریم کا تعلق صوبۂ بہار کی دھرتی بودھ گیا سے ہے، جہاں وہ 1932 میں پیدا ہوئے۔ فکری اعتبار سے وہ ایک مارکسسٹ رہے ہیں جس کا اثر ان کے ناولٹ ''گرم دن'' اور افسانوی مجموعے ''گگلو (Giglo)'' پر دیکھے جا سکتے ہیں، گرچہ انھوں نے علم وادب کے دوسرے پہلوؤں پر بھی قابل قدر کام کیا ہے اور کر رہے ہیں آزادی سے قبل عالم وجود میں آنے والے جو دوسرے افسانہ نگار مغرب میں اردو افسانے کے گیسو سنوار رہے ہیں ان میں ڈاکٹر فیروز مکرجی، فیروز جعفر، عطیہ خاں، گلشن کھنہ، قیصر تمکین، ش۔ صغیر ادیب، رضا الجبار، مقصود الٰہی شیخ، رضا علی عابدی، صفیہ صدیقی، جمشید مرزا اور جتیندر بلو وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

یہاں اگر معروف ادیبہ رضیہ فصیح احمد کا تذکرہ نہ کیا جائے تو یہ ناانصافی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ ان کا ناول ''آبلہ پا'' شہر کی وہ حدیں پار کر چکا ہے جن کے پیش نظر ان کی دوسری تصنیفات پس پشت پڑ گئی ہیں، مگر یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ مغرب خصوصاً امریکہ میں رہتے ہوئے انھوں نے اردو افسانے کی آبیاری میں برصغیر کے کسی افسانہ نگار سے کم حصہ نہیں لیا۔

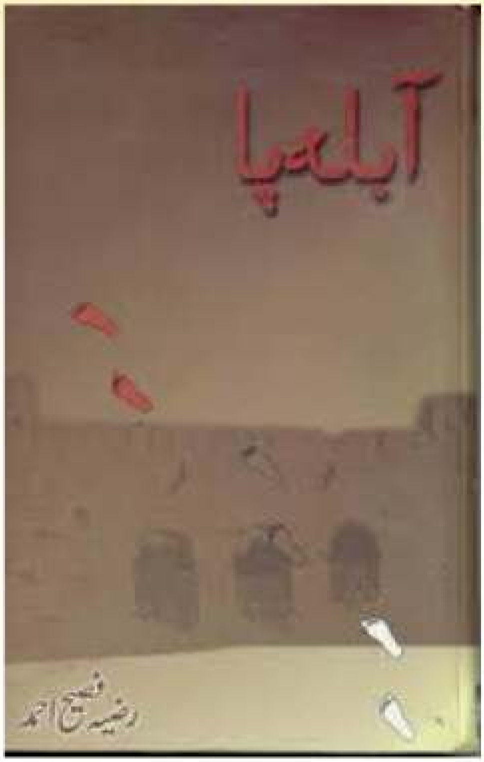

ایک بات مغرب میں لکھے گئے اردو افسانوں کے بارے میں برابر کہی جاتی ہے مگر اس کی کبھی وضاحت نہیں ملتی۔ میری مراد مغربی طرز معاشرت کی آئینہ داری سے ہے۔ یہ بات اکثر کہی گئی کہ مغرب میں جو اردو افسانے لکھے گئے ان میں مغربی طرز معاشرت کی یا تو آئینہ داری نہیں ہوئی یا اس حد تک نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہیے تھی۔ اس اعتراض کا جواب بھی یہ کہہ کر دیا جا چکا ہے کہ ایسا ہو بھی نہیں سکتا، نہ ہونا چاہیے چونکہ مشرق و مغرب کا معاشرہ مختلف ہے۔ بہر حال یہاں اسی سوال وجواب کے حوالے سے میں جس پہلو کی طرف اشارہ کرنا چاہتی ہوں وہ یہ ہے کہ مغرب میں خواہ وہ لندن ہو یا امریکہ یا پھر یورپ کا کوئی دوسرا ملک اور علاقہ، مختلف طرح کا طرز معاشرت موجود ہے۔ اس کی ایک وجہ بھی ہے۔ ظاہر ہے کسی بھی علاقے میں صرف مہاجرین نہیں رہتے نہ صرف مقامی افراد رہتے ہیں، مقامی افراد اور مہاجرین کے ایک ساتھ رہنے سے ان میں طرح طرح کے فکری عوامل سے متاثر لوگ ہوتے ہیں۔ اس نکتے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سید عاشور کاظمی نے بالکل درست لکھا ہے کہ لندن شہر میں

ہی اب ایک معاشرہ نہیں بلکہ کم از کم تین معاشرے ہیں۔ ایک معاشرہ ان انگریزوں کا ہے جن کا وطن لندن ہے۔ یہ لوگ رفتہ رفتہ اقلیت میں آرہے ہیں، چونکہ لندن مختلف طرح کی قوموں اور نسلوں کی آماجگاہ بن رہا ہے اور خود لندن کے آبائی باشندوں کو قرب وجوار کے پُرسکون علاقوں کا رخ کرنا پڑ رہا ہے۔ یہ ایک فطری عمل ہے اور ایسا ہر بڑے شہر میں کسی نہ کسی طور پر ہوتا ہے۔ بہر حال لندن میں دوسرا معاشرہ ان مہاجرین یا تارکین وطن سے تعلق رکھتا ہے جو تقسیم ہند سے قبل یا فوراً بعد گویا پچاس ساٹھ سال پہلے یہاں آئے اور جنھوں نے اپنی محنت سے اپنی دنیا بسائی۔ یہ لوگ اب اپنی دوسری نسلوں کی تربیت میں مصروف ہیں بلکہ انھیں کے زیر سایہ اپنی زندگی کے آخری دور میں آرام سے زندگی گزار رہے ہیں۔ تیسرا طبقہ بھی لندن یا دوسرے شہروں کی زندگی میں ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ یہ ایسی نسل ہے کہ جو گرچہ اپنی جڑیں تو برصغیر یا ایشیاء کے کسی ملک میں رکھتی ہے مگر یہیں کی خاک سے پیدا ہوئی اور یہیں پلی بڑھی ہے۔ اب غور کیجیے تو مہاجرین کی یہ دوسری نسل اپنے عادات واطوار اور وضع قطع بلکہ طرز فکر کے اعتبار سے بھی پہلے معاشرے سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کے ساتھ ہے گرچہ ایک حد فاصل دونوں کے درمیان ہے مگر تیسری نسل دیکھیے کہاں تک پہنچتی ہے؟

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو مغرب میں آباد اردو افسانہ نگاروں نے ابتدا سے ہی پہلے اور دوسرے معاشرے کے بیشتر قابل ذکر پہلوؤں کا تذکرہ کیا ہے اور تیسرا معاشرہ بھی بعض افسانہ نگاروں کی نگاہ میں ہے۔ اس سلسلے میں ایک اہم افسانہ نگار جتیندر بلو کو مانا جاتا ہے۔ ان کے حوالے سے یہ بات اہم ہے کہ وہ ہندوستان سے لندن آکر صرف دو سال کے قریب یہاں رہے۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ صرف ثقافتی پہچان کی بات کرتے ہیں ان کے لیے یہ لمحہ فکریہ ہے اور یہ صرف مادی آسائشوں کے حصول کی بات بھی نہیں ہے۔ آج وہ یورپ کے معاشرے کے آئینہ دار ہیں اور ہر جگہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ کہنے کا مقصد بس یہ ہے کہ صرف مغرب میں آباد کچھ عمر دراز لوگوں کے جذباتی مسائل کی پیش کش ابتدائی افسانوں میں بھلے ہی قابل قبول رہی ہو مگر اب مغرب کا اردو افسانہ بھی نئی حقیقتوں سے آنکھیں ملا رہا ہے۔

مغرب میں اردو افسانے کے آغاز سے متعلق سب سے آخری مگر اہم بات یہ ہے کہ اس کا مستقبل پوری طرح محفوظ نہ کل تھا نہ آج ہے، وہاں جب افسانہ نگاری شروع ہوئی تو اس کی باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھ میں تھی جو کسی نہ کسی طور پر اپنی جڑوں سے جذباتی وابستگی رکھتے تھے۔ ایسے میں افسانہ لکھنا صرف ایک شغل نہیں تھا بلکہ یادوں کے آئینہ خانے میں جھانک کر یادِ ماضی سے لطف اندوز ہونے کا ایک وسیلہ اور سلسلہ بھی تھا۔ یہ ایک نسل کی ایک طرح سے مجبوری بھی تھی چونکہ اس کے پاس جڑوں سے رشتہ جوڑنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا، جس معاشرے میں وہ نسل آئی تھی وہ اول تو انھیں پوری طرح قبول کرنے پر آمادہ بھی نہیں تھا۔ دوسرے وہ خود بھی کلچر کے فرق کو عبور کر کے نئے معاشرے میں مخلوط ہونے پر تیار نہیں تھی۔ اس طرح گویا ایک دوطرفہ عمل تھا جس کے سبب ایک پوری نسل جو زیادہ سے زیادہ پینتیس چالیس سال کے وقفے میں گزرتی ہے، اس طرح کے نشیب وفراز کو جھیلتی رہی اور اس کے درد کا اظہار افسانوں میں بھی ہوتا رہا۔ مغرب میں اردو افسانے کے ابتدائی نقوش اسی صورتحال کا آئینہ ہیں مگر 1990 کے آس پاس نظر ڈالیے تو یہ صورتحال بدل جاتی ہے، جیسا کہ میں نے پہلے کہا اول تو ایک نئی نسل سامنے آتی ہے، جو مغرب میں ہی پیدا ہوئی اور پروان چڑھی ہے۔ دوسرے پرانے لکھنے والوں میں بھی، بعض کو چھوڑ کر نئے حالات سے سمجھوتہ کر لینے کا ایک رجحان ابھرتا ہے۔

فی الحال مغرب میں اردو افسانے کے ابتدائی نقوش سے متعلق تین باتیں ہی تسلیم شدہ کہی جاسکتی ہیں۔ اول یہ کہ وہاں افسانہ نگاری کا آغاز ان تارکین وطن کے قلم سے ہوا جو برصغیر کے مختلف ملکوں سے یہاں آئے تھے اور جن میں سے اکثر اپنے آبائی وطن میں بھی کسی نہ کسی طور پر علم وادب سے وابستہ رہے تھے۔ دوم یہ کہ مغرب کے ابتدائی اردو افسانوں میں زیادہ تر ناسٹلجیائی جذبات کا اظہار ملتا ہے اور بہت کم افسانہ نگار ایسے ہیں جنھوں نے اپنے گردوپیش یا داخل کی دنیا سے باہر دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ تیسرے یہ کہ خواتین کی ایک بڑی تعداد ابتدا سے ہی مغرب کے اردو افسانوں کے فروغ میں حصہ لیتی رہی ہے اور ان میں سے بعض ایسی ہیں جنھوں نے اردو افسانے کی عمومی تاریخ میں بھی اپنی جگہ محفوظ کر لی ہے، گرچہ یہ بات بعض دوسرے افسانہ نگاروں پر بھی صادق آتی ہے مگر مجموعی طور پر مغرب میں اردو افسانے کا آغاز نہ تو بہت قدیم ہے نہ بہت وسیع۔ البتہ اس کے Shades برصغیر کے افسانوں سے الگ ضرور ہیں ایک خوش آئند بات ادب کے نقطہ نظر سے یہ ہے کہ ہجرت کا سلسلہ ابھی جاری ہے اور برصغیر کے مختلف ملکوں میں آنے والے کچھ نئی نسل کے فنکار بھی افسانہ نگاری کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں۔

Dr. Tasneem Fatma
48/A, First Floor
Street No 22, Zakir Nagar
New Delhi-110025

محمد شفیق

خواتین کی خودنوشتوں میں تقسیم ملک اور فسادات کا منظرنامہ

مشہور مفکر آرتھر کوئسلر (ARTHER , 1905-1983) KOESTLER نے ادب کی تعریف کرتے ہوئے کہا تھا:

''ادب ایسے ذہنی واقعات ہیں جو کہنے والے یا پیش کرنے والے کے اندر ظہور پذیر ہوتے ہیں جنہیں وہ باہر کی کائنات میں اپنے ہی جیسے دوسروں کے ساتھ بانٹتا ہے۔ اس عمل میں ترسیل کی خواہش بنیادی محرک ہوتی ہے''۔

(اردو غزل اور تقسیم ہند، عمرا لحق، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی 1998، ص:14)

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ انسانی ذہن میں جو واقعات تخیلات کی شکل میں آتے ہیں، انھیں وہ اسی باہر کی کائنات اور تجربات و مشاہدات سے اخذ کرتا ہے جس میں وہ جیتا ہے یعنی ذہن میں واقعات آنے کے لیے لازم ہے کہ وہ واقعات اس کے ساتھ پیش آئے ہوں یا وہ کسی اور کے ساتھ پیش آئے واقعے کا چشم دید گواہ ہو یا پھر دونوں باتیں ہوں یعنی وہ واقعہ اتنا بڑا ہو کہ اس کے ساتھ ساتھ اور لوگوں پر بھی اثر انداز ہوا ہو۔

بلاشبہ تقسیم ملک، فسادات اور جبریہ ہجرت، تاریخ ہند کا وہ عظیم سانحہ ہے جس نے نہ صرف لاکھوں افراد کو متاثر کیا بلکہ سیاسی، سماجی، تہذیبی، تعلیمی اور معاشی سطح پر اس نے گہرے اور دور رس اثرات مرتب کیے۔ ادب چوں کہ سماج کا عکاس اور عصری منظرنامے کا ترجمان ہوتا ہے اور ایک فنکار عام انسان سے زیادہ حساس ہوتا ہے، اس لیے تقسیم کے سانحے نے ہمارے ادب کو کچھ زیادہ ہی متاثر کیا۔ یہ تاثر اتنا گہرا تھا کہ زیادہ تر اصحاب قلم نے جس صنف میں بھی کوئی تخلیق پیش کی تو اس میں اپنے جذبات و احساسات کے ساتھ ان اثرات کو ضرور جگہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ تمام اصناف ادب میں کچھ کمی و زیادتی کے ساتھ اس موضوع پر مواد ضرور ملتا ہے۔ خصوصاً افسانہ اور شاعری میں اس سانحے سے متعلق ایک وافر ذخیرہ پایا جاتا ہے۔ ممتاز شیریں لکھتی ہیں:

''فسادات ہمارے لیے بالکل قریبی حقیقت ہیں، ہولناک، انتہائی بھیانک، ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی، آنکھوں کے سامنے کی حقیقت..... ہمیں اپنے گردوپیش کی زندگی میں ہر طرف فسادات کے بھیانک اثرات نظر آتے ہیں، فسادات نے زندگی کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ اس لیے فسادات نے ہمارے ادب پر صرف اثر ہی نہیں ڈالا بلکہ ادب پر اس طرح چھا گئے کہ عرصے تک اور کسی موضوع پر شاذ ہی لکھا گیا''۔

(معیار تنقید، ممتاز شیریں، نیا ادارہ، لاہور 1963 ص 201,202)

اسی طرح ساجدہ زیدی بھی اپنی ضخیم خودنوشت 'نوائے زندگی' میں تقسیم اور فسادات کی جانکاہ روداد کو بیان کرنے کے بعد لکھتی ہیں:

''ادیبوں کے باضمیر طبقے نے ان حالات کو درد دل میں سمو کر

اپنی تحریروں میں اس طرح سمیٹ لیا ہے کہ اس سے آئندہ نسلیں اور اہل سیاست انکار کبھی نہ کرسکیں گے۔"

(نوائے زندگی، ساجدہ زیدی، اردو اکادمی دہلی، 2012، ص: 138)

اصناف ادب میں صداقت و واقعیت کے ساتھ ساتھ سامانِ دلچسپی فراہم کرنے کے حوالے سے آپ بیتی سب سے منفرد صنف مانی جاتی ہے۔ خواتین قلم کاروں نے دیگر اصناف کے مقابلے میں اس صنف میں کچھ زیادہ ہی ورثہ چھوڑا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ رہی ہے کہ خواتین نے اپنے احساسات و جذبات کے اظہار و ترسیل کے لیے اس صنفِ سخن کو سب سے زیادہ موزوں پایا اور زبان و بیان پر قدرت کے ساتھ اپنے درد و کرب کو جب دنیا کے سامنے پیش کرنے کی ہمت کی تو خودنوشت کا ہی سہارا لیا۔ حقانی القاسمی اس تعلق سے لکھتے ہیں:

"......انجو واس نے ہندوستانی خواتین کی آپ بیتیوں کی ایک توضیحی فہرست شائع کی ہے جس میں مختلف زبانوں میں لکھی گئی خواتین کی خودنوشتوں کا اندراج ہے۔ ان خودنوشتوں کے اجمالی جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ زیادہ تر خواتین نے صرف اپنی ذات نہیں بلکہ سماج اور سیاست کے مسائل کو بھی اپنا موضوع بنایا ہے اور مرد اساس ترجیحات، سماجی رسومات اور معتقدات کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ عورتوں پر کیے جانے والے معاشرتی جبر اور پدرسری نظام کے دوہرے رویے کے خلاف آواز اٹھائی ہے۔"

(انداز بیاں یک موضوعی مجلہ دہلی، 2016، ص: 11,12)

اگرچہ اصطلاحی اعتبار سے خودنوشت کسی فرد واحد کی ذاتی زندگی کی روداد ہوتی ہے مگر اس میں بہت سے خارجی حقائق و واقعات کا بھی بیان ہوتا ہے۔ کیوں کہ کوئی بھی فرد سماجی اور سیاسی ماحول کو نظر انداز کر کے اپنی شخصیت کی مکمل تصویر پیش نہیں کرسکتا۔ تو کیسے ممکن ہے کہ تقسیم ملک اور فسادات جیسے سانحوں نے خواتین کو متاثر نہ کیا ہو؟ اس تناظر میں جب ہم خواتین کی آپ بیتیوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ خواتین کی کثیر تعداد نے اپنی آپ بیتیوں میں ذاتی حالات کے ساتھ اس المناک حادثے کے اثرات و واقعات کو ایک فریضہ سمجھ کر اسے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان رودادوں کی اہمیت اس موضوع پر لکھے گئے افسانوں سے کہیں زیادہ ہے چوں کہ اس میں کہانی اور تخیل کا سہارا لینے کے بجائے آنکھوں دیکھی حقیقت اور خود پہ گزری مصیبت کو من و عن بیان کیا گیا ہے جن کی حیثیت مستند تاریخی دستاویز سے کم نہیں۔

خواتین کی آپ بیتیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یک موضوعی مجلہ 'انداز بیاں' (مدیر: حقانی القاسمی) کے 'خواتین کی خودنوشت نمبر' میں راشد اشرف نے خواتین کی 81/ آپ بیتیوں کی فہرست پیش کی ہے۔ آگے چند اہم آپ بیتیوں میں موجود تقسیم اور فسادات کے بیانیے پر روشنی ڈالنے کی سعی کی جارہی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے اہم بیگم انیس قدوائی (1906-1982) کی خودنوشت 'آزادی کی چھاؤں میں' ہے یہ ساڑھے تین سو صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن 1974 میں اور دوسرا ایڈیشن کچھ ترمیم و اضافے کے ساتھ 1980 میں شائع ہوا۔ اس کتاب کو مختلف عنوانات کے تحت تئیس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس خودنوشت کی جتنی اہمیت اس حیثیت سے ہے کہ یہ ایک خاتون کی آپ بیتی ہے اس سے کہیں زیادہ اس وجہ سے ہے کہ اس میں ان واقعات و حادثات کا مربوط اور تفصیلی بیان ملتا ہے جو تقسیم ملک اور آزادی کے نتیجے میں پیش آئے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے یہ ایک کامیاب خودنوشت قرار دی جاتی ہے۔ مصنفہ نے اپنی بات استعاروں اور کنایوں کے سہارے خوبصورتی سے کہنے کے ساتھ ساتھ سادہ اور شستہ زبان کا استعمال بھی کیا ہے۔ جبکہ فنی اعتبار سے اسے ایک نامکمل خودنوشت کہا گیا ہے کیوں کہ اس میں مصنفہ نے اپنی زندگی کے زیادہ تر حالات کا ترتیب وار بیان نہیں کیا ہے۔ اس کے باوجود یہ کہا جاسکتا ہے کہ آزادی سے قبل اور آزادی کے بعد کے حالات کو جاننے سمجھنے کے لیے یہ خودنوشت بے حد اہم ہے۔ کیوں کہ یہ جنگ آزادی، تقسیم ملک اور اس کے نتیجے میں پیش آنے والے ہولناک فسادات کا ایسا تاریخی مرقع ہے جسے ایک چشم دید گواہ نے بڑی ہنرمندی کے ساتھ کاغذ پر اُکیرا ہے۔ ڈاکٹر شاداب سید اس خودنوشت بیانیے پر رقم طراز ہیں:

"'آزادی کی چھاؤں میں' 1947 کے خونی واقعات کا ایک پردرد مرقع ہے، جس میں تصویروں کو بڑے سلیقے سے ایسے سجایا گیا ہے کہ دیکھنے والی آنکھوں میں خون نہ اترے بلکہ ہمدردی سے بھرے آنسو ہوں۔ حالانکہ 1947 کی یہ خون بھری داستان کے سرورق پر خود مصنف کے شوہر کے لہو کے چھینٹے موجود ہیں جنھیں اس ہنگامے میں شہید کردیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے یہ روداد "جگر لخت لخت" کو جمع کرنے کی ایک کامیاب کوشش سے کم نہیں۔"

(اردو میں خواتین کی خودنوشتیں اور سماجی سروکار، شاداب سید، حسن پبلی کیشنز، ممبئی 2008، ص: 18)

کتاب کے عنوان سے ہی اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس میں ان حالات کی تصویر کشی ہے جو آزادی کی چھاؤں میں پیش آئے۔ آزادی کے دن یعنی 15 ؍اگست کی یادوں کو الفاظ کا جامہ پہناتے ہوئے مصنفہ ایک جگہ لکھتی ہیں:

''اب اس وقت مجھے 15 ؍اگست یاد آرہا ہے۔ کلکتہ سے لے کر مشرقی اور مغربی پنجاب تک کی آہوں، چیخوں اور دھوئیں میں لپٹا ہوا، آزادی کا نام نہاد دن، خون میں لتھڑی ہوئی آزادی، جس کے قدموں میں راجدھانی کی لاش پامال ہو رہی تھی اور عورتوں کی عزت لوٹ رہی تھی، دکھیوں کی پکار اور مظلوموں کی آہ و فریاد گورنمنٹ ہاؤس میں گونج اٹھی لیکن ہم سب پھر بھی خوش تھے۔ زبردستی خوش ہونے کی کوشش کررہے تھے کہ چلو خیر برسوں کی محنت ٹھکانے لگی۔ پر امید تھے کہ جو ہوا سو ہوا، غلامی کا جوا تو گردن سے اترا۔ آزادی ملنے کے بعد فرقہ واریت کا بھوت بھی سر سے اتر جائے گا۔ بیشک ملک کے دو ٹکڑے ہوگئے لیکن دونوں اپنی جگہ خوش تو رہ سکیں گے۔''

(آزادی کی چھاؤں میں، بیگم انیس قدوائی، نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا، نئی دہلی، 1980 ص:19)

آزادی ملنے کے کچھ دنوں بعد بیگم انیس اپنے شوہر کے بڑے بھائی اور وزیر مواصلات رفیع احمد قدوائی (1954 -1894) کے پاس دہلی چلی گئیں۔ ان کے گھر میں سینکڑوں افراد پناہ گزیں تھے۔ انھیں میں مشہور خودنوشت 'ڈگر سے ہٹ کر' کی مصنفہ سعیدہ بانو احمد بھی تھیں۔ وہاں ان کی ملاقات بیگم انیس قدوائی سے ہوتی رہتی تھی۔ جس دن بیگم انیس کے شوہر شفیع قدوائی کی فسادیوں کے ہاتھوں موت واقع ہوئی، اس دن کا ذکر کرتے ہوئے سعیدہ بانو اپنی خودنوشت میں لکھتی ہیں:

''ادھر یہ عالم تھا کہ خبر آئی کہ رفیع صاحب کے سگے بھائی شفیع صاحب کو کسی کٹر دیوانے نے گولی سے اڑا دیا۔ شفیع احمد قدوائی مسوری میں کسی انتظامی عہدے پر تعینات تھے اور انہیں برابر آگاہ کیا جارہا تھا کہ وہاں سے چلے جائیں، ان کی جان خطرے میں ہے۔ مگر شفیع صاحب اپنی ڈیوٹی پر جمے رہے اور وہ شہید ہوگئے۔''

(ڈگر سے ہٹ کر، سعیدہ بانو احمد، سجاد پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، 1996 ص:155)

اپنے پراثر انداز بیان اور فنی لوازمات کو برتنے کے ساتھ ساتھ نسائی جذبات و احساسات کے خوبصورت اظہار کی وجہ سے ادا جعفری (1925-2015) کی آپ بیتی 'جو رہی سو بے خبری رہی' اردو کی خودنوشتوں میں بڑی مقبول رہی ہے۔ ادا جعفری کی پیدائش تو بدایوں (اترپردیش) میں ہوئی لیکن وہ پاکستان ہجرت کرگئیں۔ انھوں نے اپنی اس خودنوشت میں تقسیم ملک کے نتیجے میں ہونے والی تباہی و بربادی کا ذکر بڑے پرسوز انداز میں کیا ہے۔ اپنی خودنوشت میں انھوں نے ایک باب 'دشت میں سامنے تھا خیمہ گل' کے عنوان سے قائم کیا ہے۔ جس میں انھوں نے پہلی جنگ عظیم سے لے کر 1947 تک کے خونی حالات کو بیان کیا ہے۔ انسانیت کو شرمسار کردینے والے اس خونی حادثے پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتی ہیں:

''زندگی آگے قدم بڑھا رہی تھی۔ زمانہ کروٹ بدل رہا تھا مگر کتنی بے رحمی کے ساتھ۔ فسادات کی آگ وقت کا ہاتھ تھامے پھیلتی چلی جارہی تھی۔ 1996 میں پہلے بہار میں اور اس کے بعد میرٹھ کے قریب گڑھ مکٹیشر میلے میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔ اور پھر پورا ملک ایک سیل بے پناہ میں گھر گیا۔ انتقام در انتقام کا ایک ایسا دائرہ تھا جس میں انسانیت سر برہنہ اور محبت سرمہ در گلو تھی۔ 47ء میں انسان آگ اور خون، نفرت اور خوف کے جس عفریت سے دوچار ہوا، اس کی یاد بھی اذیت ناک ہے۔ شہر شہر، گاؤں گاؤں مذہب کے نام پر فسادات ہورہے تھے۔''

(جو رہی سو بے خبری رہی، ادا جعفری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی، 1996 ص:98)

اردو ادب میں اپنی خدمات کے حوالے سے زیدی بہنوں کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ساجدہ زیدی (2011-1927) اپنی پانچ بہنوں میں چوتھے نمبر پر تھیں۔ 'نوائے زندگی' ان کی ضخیم خودنوشت ہے۔ اس کی ضخامت ساڑھے چھ سو صفحات سے زائد ہے۔ بنیادی طور سے یہ خودنوشت دو ابواب میں منقسم ہے جسے 57 ؍عناوین میں بانٹا گیا ہے۔ مصنفہ نے اکثر عنوانات اقبال، فیض اور مجاز کے مصرعوں پر قائم کیے ہیں۔ خودنوشت کے پہلے باب میں انھوں نے دو عنوانات 'یہ داغ داغ اجالا' اور 'ہم کہ تاریک راہوں میں مارے گئے' کے تحت تقریباً بیس صفحات میں جنگ آزادی، تقسیم اور مسلم کش فسادات کا ذکر کیا ہے۔

آزادی کی صبح جس طرح کا داغ آلود اجالا پھیلا اور ملک کے کونے کونے سے روح فرسا خبریں آنی شروع ہوئیں۔ اس حوالے سے ساجدہ زیدی اپنے مشاہدات بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''اس پہلی رات کی صبح بڑے لرزہ خیز واقعات، سانحات اور حادثات کا پیش خیمہ تھی۔ آزادی کی پہلی رات کی ابھی صبح بھی

نہیں ہوئی تھی...ہم سب اماں، ماموں، باچھو، آپا مجی، زاہدہ، شاہدہ، بیا اور میں پنڈت جواہر لعل نہرو پہلے وزیر اعظم ہند کی پہلی تقریر سن رہے تھے کہ تمام بمبئی فسادات کی خبروں سے گونج اٹھا۔ ادھر ان کی تقریر نشر کی جارہی تھی، ادھر بنگال میں قتل وخون کا بازار گرم ہو رہا تھا، دہلی لرز رہا تھا۔"

(نوائے زندگی، ساجدہ زیدی، اردو اکادمی دہلی، 2012ص:128)

ساجدہ زیدی آزادی کے وقت اپنی تین بہنوں کے ساتھ دہلی کے قرول باغ علاقے میں قیام پذیر تھیں۔ لیکن حیف کہ چند دن بعد ہی دہلی اور اس کے گردونواح میں بھی خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔

جب حالات زیادہ خراب ہوئے تو ساجدہ اور ان کے گھر والے بھیس بدل کر کسی طرح مولانا آزاد کی رہائش گاہ پہنچے اور وہیں قیام کیا اور جب حالات صحیح ہوئے تو پتہ چلا کہ ان کا گھر بار سب کچھ لٹ چکا ہے۔ پوری حقیقت ان ہی کی زبانی سنیں:

"مولانا کے رہائش گاہ کے دورانِ قیام ہم اس علم وخبر سے قطعاً محروم تھے کہ اس بار ہم مکمل طور سے لٹے ہیں۔ اب ہمارا آزاد مملکت ہند میں کوئی گھر نہ تھا۔ کہیں کوئی چارہ جوئی نہ تھی۔ سر چھپانے اور تن ڈھانکنے کا وسیلہ نہ تھا۔ کہیں انصاف نہ تھا اور ہم نوجوان لڑکیاں تھیں۔ نوعمر لڑکیاں! اور دو مسکین مرد!"

(نوائے زندگی، ساجدہ زیدی، اردو اکادمی دہلی، 2012ص:136)

اسرار الحق مجاز (1955 - 1911) کی بہنوں میں اپنے خطوط کی وجہ سے صفیہ اختر کو جو مقبولیت حاصل ہوئی، وہ ان کی دوسری بہن حمیدہ سالم (2015-1922) کو نہ مل سکی۔ لیکن انھوں نے ایک خودنوشت 'شورش دوراں' کے نام سے لکھی ہے۔ کتاب کا عنوان بھی انھوں نے اپنے بھائی مجاز کے ایک مشہور شعر سے استفادہ کرتے ہوئے اخذ کیا ہے:

کچھ تجھ کو خبر ہے ہم کیا کیا، اے شورش دوراں بھول گئے
وہ زلف پریشاں بھول گئے، وہ دیدۂ گریاں بھول گئے

حمیدہ سالم کا تعلق مجاز اور صفیہ کی طرح براہ راست ادب سے نہیں تھا بلکہ ان کا خاص میدان علم معاشیات تھا۔ مگر ان کی تربیت ادبی ماحول میں ہوئی تھی، اس لیے اردو زبان وادب سے لگاؤ ہونا لازمی تھا۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ یہ خودنوشت اردو کی خوشہ چیں ادیبہ کے قلم سے نہ ہونے کے باوجود اردو کو وسیع تناظرات میں دیکھنے کی خواہشمند ایک فنکارہ کے قلم کی دین ہے۔ اس کا شمار اردو کی اچھی خودنوشتوں میں ہوتا ہے بلکہ کمال یہی ہے کہ ایک غیر ادیبہ نے ایسی خودنوشت لکھی جو کئی ادیباؤں کی لکھی خودنوشتوں پر بھاری ہے۔ اس خودنوشت کو مصنفہ نے آٹھ ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ اس کا پانچواں باب 'آنچل اور پرچم کا ملاپ' کے نام سے ہے جس میں انھوں نے اپنے ذاتی حالات کے ساتھ جلیاں والا باغ کا قتل عام، تقسیم ہند، آزادی، فسادات اور گاندھی جی کے بہیمانہ قتل کی روداد کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آزادی کے ہولناک مناظر کو یاد کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتی ہیں:

"1947 میں ملک کو آزادی ملی۔ پیروں سے غلامی کی زنجیریں الگ ہوئیں۔ مجاہدین آزادی کے خوابوں کی تعبیر پوری ہوئی۔ ابھی آزادی کی خوشی من ہی رہی تھی کہ فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ گاندھی جی کا قتل ہوا۔ کیسی بھیانک تھی وہ فضا؟ آج بھی اس دن کا اپنے گھر کا سماں میری نظروں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ ہم سب اطمینان سے اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ اتنے میں غیر متوقع اسرار بھائی داخل ہوئے، چہرے پر ہوائیاں اڑتی ہوئیں، خبر دی کہ کسی نے گاندھی جی کو گولی مار دی ہے۔ ہم سب ہکا بکا رہ گئے۔ تھوڑی دیر کے لیے یہ گمان ہوا کہیں اسرار بھائی نے زیادہ تو نہیں پی لی اور بہک کر یہ بات کہہ رہے ہیں"۔

(شورش دوراں، حمیدہ سالم، ادب پبلی کیشنز نئی دہلی، 1995، ص:151)

آزادی کے وقت حمیدہ سالم کرامت حسین کالج، لکھنؤ میں ملازم تھیں۔ ملک کے تقریباً تمام بڑے شہر جو مشترکہ تہذیب اور مذہبی رواداری کا گہوارہ سمجھے جاتے تھے، وہ فسادات کی آگ میں جل رہے تھے مگر جیسا کہ بیگم انیس قدوائی اور ادا جعفری کی خودنوشتوں کے حوالے سے مذکور ہوا کہ لکھنؤ ایسا شہر تھا جو اس بھیانک ماحول میں بھی فسادات کی آگ میں خاکستر ہونے سے محفوظ رہا۔ حمیدہ سالم نے بھی اس بات کا ذکر اپنی خودنوشت میں کیا ہے۔ لکھتی ہیں:

"یہ شعلے یوں ہی ملک کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھے۔ ایک لکھنؤ شہر ہی ایسا تھا جو اس آگ کی لپٹ سے محفوظ تھا۔ لکھنؤ کی تہذیب کی آزمائش تھی اور اس آزمائش میں پورا اترا۔ اور فرقہ وارانہ فساد کے زہر سے محفوظ رہا۔"

(شورش دوراں، حمیدہ سالم، ادب پبلی کیشنز نئی دہلی، 1995، ص:151)

جیسا کہ مذکور ہوا 'ڈگر سے ہٹ کر' سعیدہ بانو احمد کی تصنیف کردہ خودنوشت ہے۔ یہ بارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ یہ خودنوشت ایک ایسی معمولی عورت کی داستان حیات ہے جس نے زندگی میں بہت سے نشیب وفراز

دیکھے اور تمام عمر نامساعد حالات کا سامنا کرتی رہیں لیکن اپنی خود اعتمادی کی وجہ سے ان حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے میں کامیاب رہیں۔ اس خودنوشت میں مصنفہ نے اپنے حالات کے ساتھ لکھنؤ اور بھوپال کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات کا تذکرہ بھی تفصیل سے کیا ہے۔ اس خودنوشت کا ساتواں باب 'دوراہے پر' کے عنوان سے ہے۔ اس میں انھوں نے تقسیم کے بعد ملک کے حالات کے ساتھ دہلی کے فسادات اور تباہی کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اس میں وہ کامیاب رہیں کیوں کہ وہ اس وقت دہلی میں ہی آل انڈیا ریڈیو میں ملازم تھیں۔ دہلی فسادات کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

''26،25/ اگست سے دلی کے مختلف محلوں میں مار دھاڑ شدت پکڑ چکی تھی لیکن میں ۵/ ستمبر تک معمول کے مطابق ریڈیو جاتی رہی اور خبریں نشر کرتی رہی۔ ۶/ ستمبر غالباً اتوار کا دن تھا، میری چھٹی تھی، میں روز کی طرح اٹھی اور نہانے چلی گئی۔ مشکل سے دو منٹ گزرے تھے کہ بیگم اقبال نے دروازہ کھٹکھٹایا کہ آپا جلدی باہر آیئے' بلوائی ہم پر حملہ کرنے والے ہیں۔ میں فوراً کپڑا پہن کے باہر آگئی، معلوم ہوا کہ سکندرہ روڈ کی پچاس Hutments میں دو مسلمان خاندان ہیں اور دونوں کو محلے والوں نے خبردار کیا ہے کہ آپ دونوں خاندان یہاں سے چلے جایئے، اگر مجمع نے حملہ کیا تو ہم لوگ آپ کو بچا نہیں پائیں گے۔''

(ڈگر سے ہٹ کر، سعیدہ بانو احمد، سجاد پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، 1996، ص:151)

اس کے بعد سعیدہ بانو کسی طرح سے اپنے ایک قریبی جن کو وہ محسن چچا کہتی تھیں، ان کے یہاں پناہ گزیں ہوئیں۔ جب وہاں بھی جان کو خطرہ لاحق ہوا تو وزیر مواصلات رفیع احمد قدوائی کی کوٹھی میں مقیم ہوئیں جہاں سینکڑوں لوگ پناہ لیے ہوئے تھے۔ ایک ہفتہ سے زیادہ ہو چکا تھا، قتل و غارت کا سلسلہ تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ 8/ ستمبر تک دلی کی کیا حالت ہو چکی تھی، سعیدہ بانو نے اسے بڑے دلدوز پیرایے میں بیان کیا ہے:

''شہر کا عالم یہ تھا کہ کناٹ پلیس کا بازار لٹ چکا تھا، دکانیں بند تھیں۔ یا کھول کھول کر لوٹی جا رہی تھیں، غنڈوں اور بلوائیوں نے قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ قانون کی دھجیاں اڑ رہی تھیں۔ اور سنا ہے کہ پولس خود بلوائیوں سے مل گئی تھی۔ رفیع صاحب کے یہاں اندر باہر ملا کر کوئی تین ساڑھے تین سو آدمی پناہ گزیں تھے، بازار بند تھے، دکانیں بند تھیں، لوگ اپنے اپنے گھروں میں سہمے بیٹھے تھے۔''

(ڈگر سے ہٹ کر، سعیدہ بانو احمد، سجاد پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی، 1996، ص:150)

امرتا پریتم (1919-2005) نے اپنی کئی تصانیف میں آزادی کے ساتھ رونما ہونے والے فسادات اور اس کے نتیجے میں ہوئے عورتوں پر ظلم اور ان کی ناگفتہ حالات کا بیان اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے۔ اس موضوع پر انھوں نے پنجابی زبان میں ایک یادگار نظم 'وارث شاہ سے' کے عنوان سے لکھی اور مشہور ناول 'پنجر' کی تخلیق کی۔ انھوں نے اپنی معروف خودنوشت 'رسیدی ٹکٹ' میں بھی ایک عنوان ''1947'' کے نام سے قائم کیا ہے۔ اس باب میں انھوں نے تقسیم ملک کی دلخراش فضا کا مختصر مگر بڑے ہی مؤثر انداز میں ذکر کیا ہے۔ اس المیے کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

''گو قدیم تواریخ کے بڑے ظلم و ستم سے بھرے ابواب ہم لوگوں نے پڑھے ہوئے تھے، پھر بھی ہمارے ملک کی تقسیم کے موقعے پر جو کچھ ہوا، کسی کے تصور میں بھی اس قسم کا خونی باب نہیں آسکتا۔ غم والم کے افسانے کہہ کہہ کے لوگ تھک گئے تھے، لیکن یہ افسانے عمر سے پہلے ختم ہونے والے نہ تھے۔ میں نے لاشیں دیکھی تھیں، لاشوں جیسے لوگ دیکھے تھے۔''

(رسیدی ٹکٹ، امرتا پریتم، مکتبہ اردو ادب لاہور، سن ندارد، ص:29)

اوپر کے سطور میں خواتین کے قلم سے نکلی چند خودنوشتوں کے حوالے سے تقسیم ملک، فسادات اور قتل و غارت کے روح فرسا منظر نامے کا بیان کیا گیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ادب سے متعلق خواتین بھی اپنے عہد کا باریکی سے مشاہدہ کرتی ہیں اور وہ اپنے قلم سے ظلم کے خلاف نبرد آزما ہونے کی صلاحیت بھی رکھتی ہیں۔ اس حوالے سے اگر کوئی مؤرخ ان خودنوشتوں کا مطالعہ کرے تو انھیں قابل قدر مواد مل سکتا ہے۔ ان چند کے علاوہ بھی کئی خودنوشتوں میں ان سانحات کا بیان ملتا ہے جو اپنے آپ میں ایک اہم موضوع ہے۔ لیکن اس جانب کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی ہے۔ حالانکہ درج بالا سطور سے واضح ہو گیا ہے کہ ان کی ادبی اور تاریخی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

□□□

Mohammad Shafique
Research Scholar (Urdu)
Maulana Azad National Urdu University
Lucknow Campus504/122
Tagore Marg Near Nadwa College
Lucknow-226020 (U.P)

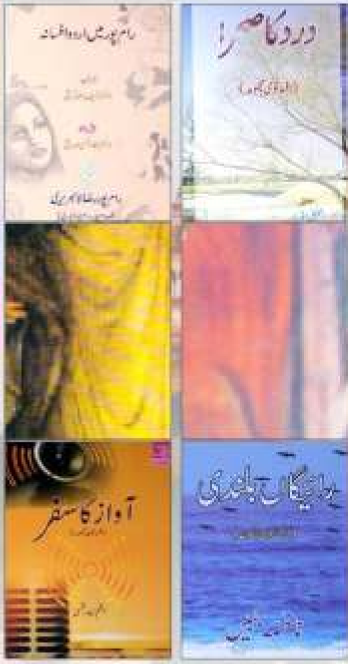

شاذیہ زرّیں

رام پور کی خواتین فکشن نگار

ایک جائزہ

ریاستِ رام پور میں نوابوں کے عہد میں علم و ادب کو جو عروج حاصل ہوا تھا وہ کسی حد تک آج بھی برقرار ہے۔ یہاں تحریر کی گئی داستانوں اور شعری تخلیقات کے بہت سے قلمی نسخے رام پور رضا لائبریری میں محفوظ ہیں اور کچھ نگارشات شائع بھی ہو چکی ہیں۔ یہاں کی شعری روایت تو مسلسل ارتقاء کی طرف بڑھ رہی ہے البتہ داستانوں کی جگہ ناولوں، افسانوں اور افسانچوں نے لے لی ہے۔ مشرقی تہذیب کے زیرِ اثر پردے میں رہنے اور گھر کی چہار دیواری میں زندگی گزارنے کے سبب شعر و ادب کی طرف یہاں کی خواتین متوجہ نہیں ہوتی تھیں۔ اگر کسی نے اس میدان میں قدم رکھنے کی جرأت بھی کی تو اسے معیوب خیال کیا جاتا تھا۔ جدید تعلیم اور سماجی و اصلاحی تحریکوں سے متاثر ہو کر رام پور کی بعض پردہ نشین خواتین قلم کاروں نے شعر و شاعری، افسانوی ادب اور علم و فن کے دیگر شعبوں میں اپنے قدم بڑھانے کی جرأت کی۔

رام پور کی خواتین افسانہ نگاروں میں پہلا نام نواب رضا علی خاں کی زوجہ رفعت زمانی بیگم عصمت آرا عسکری کا لیا جا سکتا ہے۔ انھیں شعر و شاعری کا بھی شوق تھا۔ انھوں نے شاعری کے علاوہ کئی افسانے بھی لکھے ہیں۔ اُن کے ایک افسانہ کا عنوان "میں دُلہن بنی" ہے جو افسانہ کی کسوٹی پر کھرا نہیں اترتا مگر اپنے زمانے میں بہت مقبول و مشہور ہوا تھا۔

رام پور کی ایک عمر دراز خاتون افسانہ نگار کا نام اختر جہاں ہے جو اپنے قلمی نام طاہرہ سیّد سے یاد کی جاتی ہیں۔ وہ 1970 سے افسانے لکھ رہی ہیں۔ اُن کے پہلے افسانہ کا نام "اپنا ہی گریباں بھول گئے" ہے۔ یہ افسانہ ماہنامہ بیسویں صدی نئی دہلی کے اپریل 1997 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ جس کا عنوان بھی "اپنا ہی گریباں بھول گئے" ہے، 2018 میں طبع ہو چکا ہے۔ اس مجموعہ میں چوبیس افسانوں کو شامل کیا گیا ہے جن میں سے میرا کنگڈ، اپنا دامن اپنے آنسو، سوکھی شاخیں، زرد پتے، کوٹ، خودرو پھول، اداس چاندنی اور اپنا ہی گریباں بھول گئے بہترین افسانے ہیں۔ اُن کی بیشتر افسانوی تخلیقات قصہ گوئی، پلاٹ سازی، کردار نگاری اور منظر نگاری کے اعتبار سے بھی عمدہ اور معیاری ہیں۔ اُنھیں وحدتِ تاثر کے ساتھ افسانوی تخلیقات کا آغاز کرنے اور انجام تک پہنچانے میں بھی مہارت حاصل ہے۔ پیشِ نظر ہیں ان کے ایک افسانہ "ڈھائی من کی لاش" کا ابتدائی منظر:

> "چچی جان سلام" امّی کی آواز ہمارے کان میں آئی۔ منہ اُٹھا کر دیکھا تو چچی جان چلی آ رہی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا میلوں کا سفر طے کر کے آئی ہیں۔ لپک جھپک آ کر نانی اماں کے پاس تخت پر بیٹھ گئیں۔ ہم سب بھی پڑھائی چھوڑ کر چچی جان کی باتیں سُننے بیٹھ گئے۔ چچی جان محلّہ بھر کے جھگڑے قصے نمک مرچ لگا کر سُناتی رہیں۔ اُس وقت ان کی ایکٹنگ دیکھنے کی ہے۔ جلدی جلدی پان چباتی ہیں۔ ناک اور ٹھوڑی ہلتی جاتی ہے۔ اللہ جانے یہ چچی جان کب مشہور ہوئیں۔

غالباً پہلے چچی جان تھیں، کثرتِ استعمال سے چی جان ہو گئیں۔'' (اپنا ہی گریباں بھول گئے، صفحہ 2018110)

رام پور کی ایک خاتون قلم کار خلیق النساء کے دو افسانوی مجموعے اور تین ناول شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کے افسانوں کے مجموعوں کے نام 'درد کا صحرا'، 'دامن اور کانٹے' اور ناولوں کے نام 'ماہِ پیکر'، 'بے خواب آنکھوں کے خواب' اور 'لال حویلی' ہیں۔ اُن کا ایک ناول ''مرحبا اے زندگی'' اور مضامین کا ایک مجموعہ ''صوابِ دید'' جلد ہی منظرِ عام پر آنے والے ہیں۔ خلیق النساء کی افسانوی تخلیقات صرف عورتوں کے حالات و مسائل اور اُن کی نفسیات تک ہی محدود نہیں ہیں۔ اُنھوں نے سماج میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا مشاہدہ بہت قریب سے کیا ہے اور اپنے تجربات و مشاہدات اور تلخ و شیریں حقائق کو اپنی نگارشات میں ڈھال کر پیش کیا ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوی مجموعہ ''درد کا صحرا'' میں ''کچھ میرے قلم سے'' کے عنوان کے تحت بنتِ حوّا پر ڈھائے جانے والے مظالم کا اظہار اس طرح کیا ہے :

''بنتِ حوّا کی بے بسی، بے کسی اور اُس پر ہونے والے مظالم کی تصویریں صفحۂ قرطاس پر اُترتی رہیں۔ آج ہر طرف عورت کی آزادی اور مساوات کا ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے لیکن وہ آج بھی وہیں ہے جہاں اسلام سے پہلے تھی۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ پہلے زندہ دفن کی جاتی تھی، آج قسطوں میں مر رہی ہے۔ کہیں جہیز کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھائی جا رہی ہے، کہیں مَرد کے جبر و ظلم کا شکار اور کہیں مَرد اُس کی سلطنت کو دوسری عورت کے ذریعہ تقسیم کر دیتا ہے۔''

خورشید جہاں کئی دہائیوں سے افسانے اور ناول تخلیق کر رہی ہیں۔ وہ علی گڑھ میں رہ کر ایک زمانہ تک بڑی خاموشی کے ساتھ تخلیقات کی دنیا میں گُم رہیں اور کبھی اپنے آپ کو ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے ظاہر نہیں ہونے دیا۔ جب 2011 میں اُن کا پہلا افسانوی مجموعہ شائع ہوا اور اُس کی رسمِ رونمائی رام پور میں ہوئی تو بحیثیت فکشن نگار اُن کی پہچان بنی۔ اس کے بعد اُن کا ایک ناول ''پرچھائیاں'' بھی 2018 میں شائع ہوا۔ خورشید جہاں کو ہر طبقہ کی مسلم خواتین کی نفسیات، عادات اور مزاج سے گہری واقفیت ہے۔ انھوں نے عورتوں کے ہر خوش گوار و ناخوش گوار روپ کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ عورتوں کے حالات و مسائل کے ساتھ انھوں نے جنسی بے راہ روی، رشتوں کی پامالی، توہم پرستی، حسد و لالچ جیسے موضوعات کو بھی اپنی نگارشات کے ذریعہ اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔ وہ موضوعات سے زیادہ زبان و بیان، روزمرّہ، محاوروں اور کہاوتوں پر زور دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں فن کی خامیاں بھی رونما ہو گئی ہیں اور کہیں کہیں اُن کا لہجہ اُکھڑا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ پیشِ نظر ہیں چند ایسے جملے جن میں محاوروں اور کہاوتوں کو نہایت برجستگی سے استعمال کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

-چھمّن تو کھانے پینے کی روک ٹوک مت کر، اس دن میاں تجھ پر خفا ہو رہے تھے کہ تو گھر میں اِدھر کی اُدھر کرتی پھرتی ہے، تیرا بھی وہ حال ہے، بھُس میں چنگاری ڈال جمالو الگ کھڑی۔ (افسانہ: نیا دَور)

-اگر آج پیسہ ہوتا تو بیچاری ایڑی رگڑ رگڑ کر کیوں مرتی۔ سب نے منہ پھیر لیا۔ خاندان والے تو دولت مند تھے مگر کسی نے ایک پیسہ تک نہیں دیا۔ (افسانہ: سردے کا بھاؤ)

-کلموہی نے جب سے گھر میں قدم رکھا ہے جھاڑو پھر گئی ہے۔ (افسانہ: اجنبی شہر)

عظیمہ خاتون کی پیدائش 1941 میں بریلی میں ہوئی تھی۔ اُن کا قلمی نام عظیمہ اقبال ہے۔ وہ 1985 میں رام پور آ گئی تھیں۔ اُن کا پہلا افسانہ ''مُدّا وا'' نئی دہلی کے ماہنامہ بانو میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اُن کے بہت سے افسانے اُردو اور ہندی کے اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ تسکین، پت جھڑ کے بعد، اپنی منزل کی طرف، انہونی سی بات، پسند اپنی اپنی، ہم خیال، پرچھائیں، تلخ حقیقت، نیا موڑ، چارہ گر، آنکھوں کے موتی کا شمار اُن کے بہترین افسانوں میں کیا جاتا ہے۔ اُن کی ہندی کہانیاں پرتی بمب، ممتا، گرہ شوبھا، سرس، سریتا، دوسرا پہیا، وقت وقت کی بات، خاندانی وَر، تھوڑی سی جگہ، مسکراتے آنسو ہندی زبان کے رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ اُنھوں نے انگریزی زبان کی کئی کہانیوں کا اُردو میں ترجمہ بھی کیا ہے جن کے مجموعوں کے نام 'درخشاں ستارے' اور 'ہر راہ میں' ہیں۔ ''شیکسپیر کے چند لافانی ڈرامے'' کے عنوان سے اُن کی ایک کتاب 2006 میں طبع ہو چکی ہے۔ عظیمہ اقبال علاقائی، مُلکی اور غیر مُلکی حالات و مسائل پر گہری نظر رکھتی ہیں اور انھیں افسانوی پیکر میں ڈھال کر واضح کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ عظیمہ اقبال کی افسانہ نگاری کی خصوصیت کو ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے اس طرح واضح کیا ہے :

''محترمہ عظیمہ اقبال ایک منجھی ہوئی مترجم اور کامیاب افسانہ نگار ہیں۔ اُن کا اندازِ بیان صاف، سادہ، سلیس اور دل کش ہے۔ وہ اپنے افسانوں کے کرداروں کی مناسبت سے زبان کے استعمال کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں جس

سے کرداروں کی صورت وسیرت اور عادات واطوار کی اصل تصاویر قاری کی آنکھوں میں پھرنے لگتی ہیں۔''

(رام پور میں اُردو افسانہ:صفحہ2009119)

رام پور کی ایک خاتون قلم کار نعیمہ مسعود 1967 سے پاکستان کے شہر کراچی میں مقیم ہیں اور انھوں نے وہیں کی شہریت اختیار کرلی ہے۔ انھوں نے ناول، افسانوں اور کہانیوں کے علاوہ ڈرامے، غزلیں، نظمیں اور گیت بھی لکھے ہیں۔ اُن کے پہلے افسانہ کا نام ''چوڑیاں'' ہے مگر سب سے پہلے شائع ہونے والے افسانے کا عنوان ''پن گھٹ'' ہے جو ماہنامہ عظمت، دہلی میں شائع ہوا تھا۔ اُن کے پہلے ناول کا نام ''باندی'' اور دوسرے ناول کا نام ''سفید گلاب'' ہے جو کراچی سے شائع ہونے والے رسالہ اخبارِ خواتین میں 19 قسطوں میں شائع ہوا تھا۔ اُن کے دوسَو سے زائد افسانے مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ آشیانہ، چنڈال، چھوکری، خودغرض، خون کی قیمت، بچارہ، بات، بے ایمان، اَموا تلے، آرسی، چڑیل اور جام تک نہ پہنچے کا شمار اُن کے بہترین افسانوں میں کیا جاتا ہے۔ مات، فریب، خون کی قیمت، سکونِ دل کی خاطر، پُرانے قلب نئے قالب، کنوارا گھر، علاج اور اُن کے دیگر ڈرامے ہندو پاک کے اخبارات ورسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ نعیمہ مسعود خواتین کے حالات و مسائل، نفسانی خواہشات، ہلکے پھلکے رومان اور مسلم معاشرے کی کمزوریوں کو بیانیہ اور مکالماتی انداز میں اس طرح اُجاگر کرتی ہیں کہ تمام تصویریں نگاہوں میں پھرنے لگتی ہیں۔ اُن کے افسانہ ''خودغرض'' کی شمّو آپا عبادت گزار بھی ہیں اور دادی ماں کے ساتھ وظائف بھی کرتی ہیں۔ جدید حالات اور نئی روشنی سے متاثر ہوکر اُس کے مزاج اور دیگر فرماں بردار کنواری لڑکیوں میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں اُس کی عکّاسی انھوں نے اس طرح کی ہے :

> ''دائی ماں کے وظیفوں میں شریک، حویلیوں میں نیاز کی شیرینی تقسیم کرنے والی، اپنی کنواری پیشانی کا نور فراخ دلی کے ساتھ لُٹا دینے والی آپا شمّو ایک دم کنجوس بن گئی۔ وظیفوں سے وحشت ہونے لگی۔ سجدوں سے بے نیاز ہونے لگی۔ بڑی سرکار کے عبادت کدے کو دیکھ کر ہَول آنے لگا اور دائی ماں کا بوڑھا وجود تو گویا سب ہی کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکنے لگا۔ ریشمی رخساروں اور دراز گیسوؤں والی فرماں بردار کنواریاں سرکشی پر آمادہ ہوگئیں۔ مشورے دیتیں۔ دادی امّاں کو ایسی گولی دے کر آؤ کہ عشاء کی نماز سے قبل بیدار نہ ہوسکیں۔ یہ بوڑھے دقیانوسی لوگ آخر کیوں ہماری خوشیوں کے دشمن بن جاتے ہیں۔ ان سے کہہ دو عبادت کدوں سے باہر نہ آئیں ورنہ ہمارے بے باک قہقہوں کی جھنکاریں انہیں ناگوار گزریں گی۔''

(رام پور میں اُردو افسانہ، ڈاکٹر شریف احمد قریشی، صفحہ193، 2009)

دورِ حاضر کی خواتین افسانہ نگاروں میں نکہت افلاک کا نام نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اب تک اُن کے تین افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کے نام 'پلکوں سے پلکوں تک'، 'ایک اور دستک' اور 'ناچیز' ہیں۔ وہ طالب علمی کے زمانہ ہی سے افسانہ نگاری کی طرف متوجہ ہوگئی تھیں۔ ہائی اسکول کے زمانے ہی میں اُن کے کئی افسانے عکسِ نو کراچی، جامِ نو کراچی، ترجمانِ سرحد پیشاور جیسے رسالوں میں شائع ہو چکے تھے۔ جب اُن کے والدِ محترم نے ان کی افسانہ نگاری پر پابندی لگا دی تو اُن کا قلم رُک سا گیا۔ پھر ایک عرصہ کے بعد 1971 میں انھوں نے والدِ محترم کی مرضی کے خلاف ایک افسانہ ''پریما'' کے عنوان سے لکھا جو میرٹھ سے شائع ہونے والے رسالہ 'روشنی' میں شائع ہوا تھا۔ جب سے اب تک اُن کا افسانوی سفر جاری ہے۔ اُن کا پہلا افسانہ ''اور گومتی جاگتی رہی'' رام پور کے روزنامہ ناظم میں شائع ہوا تھا۔ نکہت افلاک کے افسانوی موضوعات بے روزگاری، بھوک، افلاس، بدنظمی، سیاسی حالات، سماجی زندگی، طبقاتی کشمکش اور مذہبی منافرت ہیں مگر اکثریت نسوانی صورتِ حال اور مسائل ہی کی ہے۔ اُن کے کئی افسانوں میں شعور کی رَو کی تکنیک کی کہیں ہلکی اور کہیں گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ اُنھوں نے اپنے افسانہ ''بنجارن'' میں شعور کی رَو کی تکنیک کا بہترین استعمال کیا ہے۔ ساجھا چولھا، ناچیز، احساس کے جھروکے سے، کچّا آنگن، تقسیم ایک روٹی کی، چاند جسے روندا گیا، مختاران، لالٹین، بے نظیر لاج اور آنا اسی دیس میری لاڈو کا شمار اُن کے بہترین افسانوں میں کیا جاتا ہے۔

نیّر حسیب نیّر رام پور کی ایک گُم نام افسانہ نویس تھیں۔ اُن کے والد لڑکیوں کے لیے افسانہ نویسی کو معیوب سمجھتے تھے۔ انھوں نے نیّر پر سخت پابندیاں عائد کردی تھیں۔ اس لیے وہ چھپ چھپ کر افسانے لکھتی تھیں۔ اب تک اُن کے ایک ہی افسانے کا پتہ چل سکا ہے جس کا عنوان ''آئیڈیل'' ہے جو بیسویں صدی نئی دہلی کے ایک شمارے میں شائع ہوا تھا۔ انھوں نے اس رسالہ کے مدیر خوشتر گرامی کو جو خط لکھا تھا اس میں اپنے پورے نام کو ظاہر نہ کرنے اور نیّر حسیب کے بجائے صرف نیّر لکھنے کی درخواست کی تھی۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی نے اُن کی افسانہ نویسی کے

متعلق لکھا ہے کہ :

''تمام تلاش وجستجو کے باوجود 'آئیڈیل' کے علاوہ اُن کا کوئی اور افسانہ اب تک دستیاب نہیں ہو سکا۔ اس لیے محض ایک افسانہ کے بنیاد پر موصوفہ کی افسانہ نویسی کے رجحان کے علاوہ موضوعات یا نظریات وغیرہ پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی جا سکتی۔ اُن کے اسلوب یا اندازِ بیان کی جھلک کے لیے اُن کے مذکورہ افسانہ کے آغاز کی چند سطور ملاحظہ فرمائیے :

مریم کی پاکیزگی، سیتا کی حیا، حوروں کا تقدّس، پھولوں کی دل کشی، کلیوں کی تازگی، غنچوں کا تبسّم، عندلیب کا ترنّم، ان سب سے مل کر جو تصویر بنتی تھی وہ تھی عارفہ، ہمیشہ سفید لباس، سیدھے سادے کپڑے، پیشانی کو چومتا دوپٹہ''

نیّر حبیب کی تاریخ پیدائش 29/ مئی 1949 ہے۔ بیٹے کی ولادت کے وقت 17/ اپریل 1989 کو اُن کی اور اُن کے نومولود بچّے کی وفات ہوگئی تھی۔

ڈاکٹر ناظمہ جبیں افسانہ نگار، محقق، نقاد، خاکہ نگار، مضمون نویس اور شاعرہ کی حیثیت سے جانی پہچانی جاتی ہیں۔ اُن کا پہلا افسانہ ''یتیم کی فریاد'' ہے جو انھوں نے اس وقت لکھا تھا جب وہ ہائی اسکول کی طالبہ تھیں۔ رائیگاں بلندی، نظر بندی، بندگی، خاموش انتظار، بازیچۂ اطفال، سونامی، ایک ڈال کے پنچھی، پسِ پردہ، بازار، انگوٹھی کا زخم، رہائی اور پردہ جیسے اُن کے افسانے روزانہ کی زندگی میں رونما ہونے والے حالات و مسائل کے ترجمان ہیں۔ اُن کے ایم فل کا مقالہ عزیز احمد فن اور نظریہ، افسانوی مجموعہ رائیگاں بلندی اور خاکہ پروفیسر محمد شفیق کی کہانی کچھ اُن کی کچھ میری زبانی شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کا ایک ناول دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت، افسانے کے فن سے متعلق ایک کتاب اُردو کا علامتی افسانہ : افسانوی فن کی بلندی یا پستی اور مضامین کا ایک مجموعہ زیرِ اشاعت ہیں۔

ڈاکٹر ناظمہ جبیں اپنے گرد و پیش کے ماحول اور روزانہ کی زندگی میں رونما ہونے والے بظاہر معمولی واقعات و حادثات کا مشاہدہ نہایت باریک بینی سے کرتی ہیں اور پھر انہیں غیر اہم واقعات و حادثات کو آسان و عام فہم زبان میں اس طرح پیش کرتی ہیں کہ ان کے افسانے نہایت اہم اور قابلِ غور و فکر معلوم ہونے لگتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کی اس خصوصیت کا اظہار اپنی پہلی افسانوی تخلیق کے پیش لفظ میں اس طرح کرتی ہیں :

''انگریزی کے مشہور فکشن نگار تھامس ہارڈی (Thomas Hardy) نے اپنے ناولوں کو لکھتے وقت اس بات پر خاص توجہ دی ہے کہ جو کردار تخلیق کیے جائیں وہ ہمارے تمدّن اور ہمارے گرد و پیش کے ماحول سے مملو ہوں نہ کہ ان کو سمجھنے کے لیے خود پڑھنے والے اپنے تخیّل کی پرواز میں کھو جائیں۔ چنانچہ ہارڈی کی شہرت ہی اس کے Wessex ناولوں کی وجہ سے ہوئی۔ کہنے کا مطلب ہے کہ جس خطّے سے آپ تعلق رکھتے ہیں وہاں کی آب و ہوا، رسم و رواج، رہن سہن، لباس و زیبائش اور کھانے پینے کے طور طریقے آپ کی تخلیقات میں ایک خاص مقام حاصل کرتے ہیں تو اس خطّے کے ساتھ ساتھ آپ کی تخلیق کو بھی ایک خاص شناخت ملتی ہے۔

راقم الحروف بھی اپنے بیس پچیس سال کے اس افسانوی سفر میں اپنے خطّے کی تہذیب اور ماحول کے اثر سے بچ کر کہاں جاتی۔ اس نے جو دیکھا، سمجھا اور جن واقعات یا حادثات نے اس کی تخلیقی ذہن کو جھنجھوڑا وہ اس کے قلم سے سیدھے سادے لفظوں میں ڈھل گئے۔ دانستہ طور پر ان میں نہ کوئی علامتی پیچیدگیاں لائی گئیں اور نہ استعاراتی یا اسطوری موشگافیاں سے تحریر کو بھاری بھرکم کیا گیا۔''

(رائیگاں بلندی، صفحہ 9-8، 2011)

انجم بہار شمسی کا شمار رام پور کی بہترین خواتین افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے۔ انھوں نے افسانوں اور ناولوں کے علاوہ تبصرے اور مضمون بھی تحریر کیے ہیں۔ انھیں شعر و شاعری سے بھی دل چسپی ہے۔ اُن کے دو سَو سے زائد افسانے مقامی اور ہند و پاک کے اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اُن کے ناولوں کے نام قصرِ دل، سائبان، شیشے کا مسیحا، ہنستے زخم، تقدیس، خار و گل، صبحِ بہاراں اور تاریک اُجالے ہیں۔ شمعِ حرم، ہیرے کا سفر، بھابھی بیگم اور خواب کی تعبیر کا شمار اُن کے بہترین افسانوں میں کیا جاتا ہے۔ وہ اپنی افسانوی تخلیقات کے ذریعہ اسلامی و مشرقی تہذیب سے وابستگی اور مغربی بے راہ روی کی خامیوں کا اظہار نہایت سلیقے سے کرتی ہیں۔ اُن کے بیشتر ناول اور افسانے معاشرتی و اصلاحی ہیں۔ اُن کا اندازِ بیان صاف، سادہ اور عام فہم ہے۔ وہ اپنی بات کو محاوروں، کہاوتوں، قرآنی آیات اور احادیث کے ذریعہ موثر بنانے کے ہنر سے بخوبی واقف ہیں۔ ڈاکٹر شریف احمد قریشی کی درج ذیل تحریر سے اُن کی افسانہ نگاری کی بنیادی خصوصیات بخوبی واضح ہو گئی ہیں۔

''محترمہ انجم بہار شمسی کے افسانوں کے موضوعات زندگی کی صداقتوں اور حقائق پر مبنی ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کے پلاٹ

روزمرہ کی سماجی زندگی میں رونما ہونے والے واقعات و حادثات اور اردگرد کے ماحول ومشاہدات سے اخذ کرتی ہیں جن میں اُن کے نظریات وافکار کو بھی نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ دراصل اُن کی ذات میں چھپے ہوئے افسانہ نگار کو اُن کی ہر کہانی میں آسانی سے تلاش کیا جاسکتا ہے۔ اُنھوں نے اپنے افسانوں میں اعلیٰ اقدار کا زوال، معاشی بدحالی، بے راہ روی، رشتوں کے تقدّس کی پامالی، فیشن پرستی، مذہب سے بے زاری وغیرہ کو نہایت چابک دستی سے منعکس کرنے کی کوشش کی ہے۔ اُن کے کئی افسانے ماں، باپ، بیٹا، بیٹی، بھائی، بہن، بھابی، دیور جیسے انسانی رشتوں بالخصوص دورِ حاضر میں ازدواجی زندگی کے حالات، مسائل اور تقاضوں کے نہ صرف عکاس ہیں بلکہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ سورۃ الروم کی اس آیت کی روشنی میں تخلیق کیے گئے ہیں :

وَمِنْ اٰیٰتِہٖٓ اَنْ خَلَقَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجاً
لِّتَسْکُنُوْٓا اِلَیْھَا وَجَعَلَ بَیْنَکُمْ مَّوَدَّۃً وَّرَحْمَۃً

(اور اللہ کی نشانیوں میں یہ ہے کہ اُس نے تمھارے لیے تمھاری جنس سے جوڑے بنائے تاکہ تم اُن کے پاس سکون حاصل کر سکو اور تمھارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کردی۔)

(آواز کا سفر: انجم بہار شمسی، صفحہ 9-158-2015)

نصرت شمسی کی زیادہ تر افسانوی تخلیقات گھریلو زندگی، خواتین کے حالات ومسائل اور حقائق کی ترجمان ہیں۔ اُن کے بعض افسانے معاشی، سماجی اور دیگر مسائل کے بھی بہترین عکاس ہیں۔ وہ ادب برائے ادب کے بجائے مقصدی ادب کی قائل ہیں۔ اُن کے یہاں رومانی فضا سے مملو افسانے بھی نظر آتے ہیں۔ نصرت شمسی کی تین افسانوی تخلیقات منظرِ عام پر آچکی ہیں جن کے نام ماہِ تمام، اوڑھنی اور تاج محل ہیں۔ ماہِ تمام میں پندرہ افسانوں اور تین ناولٹ کو شامل کیا گیا ہے۔ ''اوڑھنی'' دو ناولٹ کا مجموعہ ہے جن کے عنوانات اوڑھنی اور جو چلے تو جاں سے گزر گئے ہیں۔ تاج محل میں تیرہ افسانوں اور چھ ناولٹ کو شامل کیا گیا ہے۔ پھانس، امتحان، بوجھ، تصویرِ کائنات، تاریکی، آئینہ وقت کا، نئی ممی، روزن سے پھوٹی کرن، بوجھ، آشیانہ اور ایفائے وعدہ کا شمار اُن کے بہترین افسانوں میں کیا جاتا ہے۔ اُن کی بیشتر افسانوی تخلیقات تجربات ومشاہدات پر مبنی ہیں۔ وہ اپنی تخلیقات میں ایسے سودمند، سبق آموز اور معنی خیز نکات کی طرف بھی متوجہ کرنا چاہتی ہیں جن سے باہمی چپقلش، تلخیوں اور نفاق کو نہ صرف کم کیا جاسکتا ہے بلکہ زندگی کو خوش گوار بھی بنایا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ ان کے افسانہ ''فیصلہ'' کی درج ذیل سطور سے بھی واضح ہو رہا ہے :

''میکہ اتنا قریب ہونا بھی ٹھیک نہیں ہے کہ لڑکی ہر چھوٹی چھوٹی بات میکے میں آکر کہنے لگ جائے یا پھر اُسے اپنے اندر اتنی صلاحیت پیدا کرنی چاہئے کہ حالات کو سمجھے اور اُس کا حل اُسی گھر میں رہ کر نکالنے کی کوشش کرے۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں زندگی ہونے کا احساس دلاتی ہیں۔ اگر اس طرح سب کرنے لگ جائیں تو کبھی کسی کا گھر بس ہی نہ پائے۔''(ماہِ تمام، صفحہ 89-88-2011)

صائمہ ذوالنور کے پہلے افسانوی مجموعہ کا نام 'سرِ شاخِ گل'' ہے جو 2020 میں منظرِ عام پر آیا ہے۔ اس مجموعہ میں 9 افسانوں کی شمولیت ہے جن کے عنوانات بالترتیب 'وہ میری محبتوں کا ریاض تھا'، 'مہربان رفاقتیں'، 'یہ بہار کیسی آئی'، 'سُکھ کے موسم کا قاصد'، 'سرِ شاخِ گل'، 'وہ نئے گلاب کی دستکیں'، 'اولڈ ہاؤس'، 'جو گزر گیا سو گزر گیا' اور 'رائیگاں ساعتوں کا دُکھ' ہیں۔ صائمہ ذوالنور نے اس مجموعہ کے پیشِ لفظ میں انکشاف کیا ہے کہ انھوں نے اپنی پہلی کہانی اس وقت لکھی تھی جب وہ درجہ چہارم کی طالبہ تھیں اور تقریباً بیس پچیس سال سے باقاعدہ طور پر افسانے تخلیق کر رہی ہیں۔ ان کے افسانوں میں مقصدیت اور اصلاح کے پہلو کو نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اُن کی بیشتر افسانوی تخلیقات عہدِ حاضر میں رونما ہونے والے حالات ومسائل کی بہترین آئینہ دار ہیں۔

گلناز صدیقی اور ایمن تنزیل کے نام بھی رام پور کی خواتین افسانہ نگاروں کی فہرست میں شامل ہو گئے ہیں۔ گلناز صدیقی نے غزلوں کے علاوہ چند افسانے بھی تخلیق کیے ہیں۔ اُن کا ایک شعری اور ایک افسانوی مجموعہ زیرِ ترتیب ہے۔ ایمن تنزیل کے چند افسانے، افسانچے اور مضامین مختلف اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ اس تحقیقی وتنقیدی جائزے کے پیشِ نظر کہا جاسکتا ہے افسانوی ادب کی دنیا میں رام پور کی خواتین کی خدمات بہت زیادہ حوصلہ بخش نہیں تو مایوس کن بھی نہیں ہیں۔

Shazya Zarrin
Research Scholar
Jain Mandir Street
Phoota Mahal
Rampur-244901 (U.P)

کچے رنگوں کی محبت

ناہید طاہر

محفلِ مشاعرہ، جس پر رنگینی چھائی ہوئی تھی یہاں ہر طرح کے غزل گو شاعر مدعو تھے۔ کسی نے انقلابی کلام پیش کیا اور کسی نے نیم رومانوی اشعار سے سامعین کے دلوں کے تار چھیڑ دیے تھے۔ لیکن فائزہ پروین، کے آتے ہی ایک پُرکیف سماں بندھ گیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح محفل پر چھا گئی۔ سامعین اور معزز صدر کی طرف سے اتنی پذیرائی اور دادِ تحسین حاصل ہوئی کہ وہ مغرور ہونے لگی۔ اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ مشاعرہ جب اختتام کو پہنچا تو مختلف النوع ضیافتوں سے سجے میز پر پروین نے ڈنر کیا۔ کچھ ساعتوں بعد ہاتھ میں پیپسی کا ٹن لیے لان میں چلی آئی۔ لان کی کھلی فضا اس کے بدن کے ساتھ جیسے روح کو معطر کر گئی۔ وہ پیپسی کے چھوٹے چھوٹے سِپ لیتی ہوئی ٹہل رہی تھی، اچانک کہیں سے خوبصورت آواز سماعت سے ٹکرائی۔ آواز میں اتنا سحر تھا کہ وہ مبہوت ہو کر اس کی طرف کھنچتی چلی گئی۔ پتا نہیں کون تھا جو اس کا کلام نہایت خوبصورت ترنم میں پڑھ رہا تھا۔ سُر کی تان ٹوٹی تو اس پر چھایا سحر بھی ٹوٹا اور وہ بے اختیار تالیاں بجانے لگی۔ وہ شخص بدحواسی کے عالم میں کھڑا ہوا اور دوسرے ہی پل حیرت و مسرت سے کہہ اٹھا۔ "فائزہ پروین آپ؟" جواب میں پروین دلفریب انداز میں مسکرائی اور کچھ توقف کے بعد گویا ہوئی۔ "آپ کی آواز بہت خوبصورت ہے!" دوسرے ہی لمحے پروین کے چہرے پر حیرت کی پرچھائیاں لہرا گئیں۔ اس غیر متوقع طور پر رونما معجزے سے وہ حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ دل و دماغ پر یادوں کا دھواں پھیلنے لگا۔ 'معاذ' وجود کے تئیں ایک طوفان سا اٹھا۔ وہی جاذبِ نظر، بلند قد، خوبرو نوجوان جس کی آنکھوں پر صرف عینک کا اضافہ ہوا تھا۔ وہ خاموش تھی، اس کی سماعت سے اس شخص کی گھمبیر آواز ٹکرائی۔ "یقین کریں، میں آپ کا بہت بڑا مداح ہوں۔" جواب میں پروین نے دلفریب انداز میں مسکراتے ہوئے شیریں آواز میں اجازت طلب کی۔ "کیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں۔؟"

"شرمندہ نہ کریں یہ تو میری خوش نصیبی ہوگی" اس کا لہجہ پُرمسرت تھا۔ پروین شکریہ ادا کرتی ہوئی اس کے پہلو میں بیٹھ گئی۔ کچھ لمحات تعارفی گفتگو کی نذر ہوئے پھر معاذ، اجازت طلب کرتا ہوا پروین کی پہلی غزل اپنی خوبصورت آواز میں سنانے لگا جو ابتدائی دنوں میں بہت ہی مشہور ہوئی تھی۔ فلک پہ چمکتا چاند اور لان کے کناروں پر کیاریوں میں سجے پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو نے دل و دماغ کو معطر کیا۔ آواز کا جادو تھا یا ماحول کا سحر، دونوں کے وجود پر سرور بخش کیفیت طاری ہونے لگی۔ معاذ کے پاس پروین کے کلام کا ایک ذخیرہ موجود تھا، پروین کی سانسیں سینے میں الجھنے لگیں۔ جس کی یاد اور ہجر میں قید ہو کر، اس نے بے شمار اشعار لکھے تھے۔ وہی شخص ساری امانتیں سنبھالے، حقیقت کا روپ دھارے اس کے پہلو میں بیٹھا ہوا تھا۔ "مجھے آپ کے کئی اشعار یاد ہیں۔"

"اچھا۔۔۔۔"

"آپ استادِ سخن ہیں۔" یہ سن کر پروین دوبارہ مسکرائی اور شکریہ ادا کیا۔

"آپ کا آٹوگراف چاہتا ہوں۔" اس نے ڈائری پیش کی۔ پروین کچھ تذبذب کا شکار ہوئی پھر ہاتھ بڑھا کر ڈائری لی اور لکھا

"اس حقیقت کے نام جسے میں نے سراب سمجھا!!" نیچے اپنا نام لکھ دیا۔ خوبصورت عبارت کا مفہوم سمجھنے سے قاصر معاذ کے چہرے پر مسرت خیز تبسم چھا گیا۔ "بہت بہت شکریہ۔۔۔ آپ شملہ سے تعلق رکھتی ہیں؟"

"جی۔۔۔۔"

"میرا آبائی وطن بھی وہی ہے"

"مجھے پتا ہے"

"کیا مطلب؟" معاذ حیرت سے پروین کو دیکھنے لگا۔

"ہم کبھی پڑوسی تھے"

"واقعی۔۔۔؟ تعجب کا مقام ہے؟ مجھے اس بات کا علم ہی نہیں؟" وہ ایک بار پھر حیرت سے اچھل پڑا۔

"مرتضیٰ احمد خان میرے والد محترم ہیں" پروین نے انکشاف کیا تو وہ کھل کر مسکرایا۔

"اوہ! بالکل پڑوس میں ان کا مکان تھا۔ لیکن میں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔؟ جبکہ ان کے ایک فرزند، علی میرے ہم عمر تھے۔ ان سے رسمی تعلقات تھے"

"جی! ابو کی خواہش تھی کہ علی بھائی آپ جیسے ہونہار انسان بنیں۔۔۔!"

"اوہ!" معاذ، پروین کی باتیں بڑی دلچسپی سے سنتا ہوا مسکرائے جا رہا تھا۔

"محلے میں سب آپ سے متاثر تھے"

"یہ بات قابل قبول نہیں!!" اس نے شرمندگی سے ہنستے ہوئے کہا۔ اس طرح گفتگو کا سلسلہ تقریب کے اختتام تک جاری رہا۔

"کل کی شام آپ کے ساتھ گزارنا چاہتا ہوں، کہیں آپ مصروف تو نہیں؟"

"میں نے تو زندگی سونپ رکھی ہے، ایک شام کی بات کر رہے ہو؟" پروین کی دھڑکنیں شکوہ کر گئیں۔ پروین کو خاموش پا کر اس نے دوبارہ اصرار کیا۔ "ان شاء اللہ۔۔۔ میں کوشش کرتی ہوں"

معاذ ایک سافٹ ویئر انجینئر تھا۔ سلجھا ہوا، قابل انسان، محلے کے بزرگ چاہتے تھے کہ ان کی اولاد بھی معاذ کی روش اختیار کرے۔ خود پروین کے والدین کی آرزو تھی کہ ان کا بیٹا علی، معاذ جیسا ہونہار بنے۔ گھر میں صبح و شام صرف معاذ اور اس کی خوبیاں کا ذکر ہوتا تھا۔ پروین، معاذ کی خوبیوں سے واقف تو نہ تھی ہاں دن رات کے ذکر نے اس کے دل میں معاذ کے لیے حسین و رنگین جذبات بیدار کیے۔ دل ہولے ہولے دھڑکنے لگا اور ان دھڑکنوں پر معاذ کا نام لکھا جانے لگا۔ وہ ہر پل اسے سوچتی اور تنہائی میں اس کے تصور سے ڈھیر ساری باتیں کرتی۔ خوبصورت جذبات و احساسات سے مزین وقت کھلکھلاتا ہوا آنکھ مچولی کھیلتا تیزی سے گزر گیا۔ معاذ، ترقی کی منازل طے کرتا چلا گیا۔ اس کے برعکس پروین کی زندگی کچھوے کی مانند رینگنے پر مجبور تھی۔ مفلسی، بے روزگاری، آہیں اور تفکرات نے گھر کے آنگن میں بسیرا کر رکھا تھا۔ امن اور سلامتی کے کبوتر کا یہاں گزر نہ ہوتا۔ ان حالات میں پروین کی شادی بہت بڑا مسئلہ تھی۔ غریبی اس قدر تھی کہ شادی کے تئیں سوچنا جیسے جرم تھا۔ اکثر وہ خیالوں کی مہکتی راتوں میں معاذ کے ساتھ ایک زندگی جی لیتی، احساس کے دھویں کو ڈائری میں تحلیل کرنے کی کوشش کرتی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ ایک شاعرہ بن کر دنیا کے سامنے ابھر آئی۔ بے رحم وقت نے کوئی کروٹ نہیں بدلی، صرف یہ احسان کیا کہ اسے وقت کی معروف ترین شاعرہ بنا دیا۔ معاذ نے کسی امیر زادی سے شادی کر لی اور یہ خبر پروین پر بجلی بن کر گر پڑی تھی۔ وہ جیسے غم و یاس کے سمندر میں ڈوبتی چلی گئی۔ اس کے اشعار میں یاسیت، ہجر اور تنہائی کے رنگ اترنے لگے۔ پھر ایسا ہوا کہ شادی کے چند ہی ہفتوں بعد وہ اپنی بیوی کو لے کو پتا نہیں کہاں روپوش ہو گیا۔ اس بات کا کسی کو کوئی علم نہ ہو سکا۔

"معاذ کی گاڑی وسیع سڑک پر فراٹے بھرتی ہوئی منزل کی جانب کوشاں تھی۔ دونوں کے درمیان بوجھل سی خاموشی طاری تھی۔ ہاں دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ خوبصورت جھیل کے کنارے پہنچ کر معاذ نے گاڑی پارک کی۔ گنگناتی ہوئی سرمئی شام کا منظر بہت حسین اور دلفریب تھا۔ پرندے، رنگ برنگی، شوخ مچھلیوں کا شکار کرتے ہوئے مغرور نظر آرہے تھے"

معاذ کی گاڑی وسیع سڑک پر فراٹے بھرتی ہوئی منزل کی جانب کوشاں تھی۔ دونوں کے درمیان بوجھل سی خاموشی طاری تھی۔ ہاں دل کی دھڑکنیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ خوبصورت جھیل کے کنارے پہنچ کر معاذ نے گاڑی پارک کی۔ گنگناتی ہوئی سرمئی شام کا منظر بہت حسین اور دلفریب تھا۔ پرندے، رنگ برنگی، شوخ مچھلیوں کا شکار کرتے ہوئے مغرور نظر آ رہے تھے۔ بطخوں کے خوبصورت جوڑے ایک دوسرے سے

چونچ ملاتے ہوئے جیسے عہد و پیماں نبھانے کی قسمیں کھاتے ہوئے نظر آئے۔ یہ نظارہ سیاحوں کی دلچسپی کا خصوصی مرکز بنا ہوا تھا۔ سیاحوں کے موبائل سیلفی کے ذریعے ان کی معصوم محبت کے گواہ بنتے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ سرسراتی ہوائیں اور ان ہواؤں سے اڑتے خشک زرد پتے، ڈوبتے سورج کی سنہری کرنیں، ماحول کو ایک جادوائی کیفیت بخش رہی تھی۔ معاذ پروین کی کئی غزلیں خوبصورت ترنم میں سنانے لگا۔

"آپ کی فیملی اور بچے کیسے ہیں؟" اس اچانک کیے گئے سوال پر معاذ بجھ گیا۔ پروین نے محسوس کیا کہ ذاتیات پر مبنی سوال شاید معاذ کو ناگوار گزرا تھا۔ "آپ سنائیں آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟ آئے دن یہ موضوع میڈیا پر خوب گردش میں رہتا ہے۔" معاذ نے سوال کے جواب میں سوال داغا تو پروین ہنس پڑی۔

"آپ میرا سوال تو حذف کر گئے۔ خیر! شادی نہ کرنے کی وجہ، مجھے کسی شہزادے سے عشق ہو گیا تھا"

"کہیں وہ میں تو نہیں؟"

"خوش فہمی" پروین زور سے ہنسی، معاذ بھی ہنسنے لگا۔

"مجھے اکثر ڈوبتے سورج کی کرنیں اداس کر دیتی ہیں، حیرت ہے آج میں اداس نہیں" پروین سنہری بوجھل کرنوں کو دیکھتی ہوئی گنگنائی۔ معاذ اس کی جھیل سی گہری آنکھوں میں کھو گیا۔ فطرت کا لطف اٹھاتے ہوئے دونوں نے اس شام کو یادگار بنایا۔

دوسری شب معاذ نے پروین کو ڈنر پر مدعو کیا۔ اس کی نگاہیں معاذ کی بیگم اور بچوں کو تلاش کر رہی تھیں۔ معاذ اس کی کیفیت بھانپتے ہوئے ہنسا۔

"شاید آپ میری بیگم اور بچوں کو ڈھونڈ رہی ہیں؟"

"جی ہاں۔۔۔"

"میری بیوی میرے ساتھ نہیں رہتی!!"

"میں سمجھی نہیں؟"

"شادی کے صرف چند ماہ بعد ہی اس نے مجھ سے خلع لے لیا تھا" پروین حیرت سے معاذ کو دیکھنے لگی۔ معاذ ایک قابل انسان تھا۔ دنیا کی ہر نعمت اور آسائش اس کے قدم چوم رہی تھی۔ بیوی کا خلع لینا یقیناً ایک معمہ تھا۔ کھانا، معاذ نے خود بنایا، جو بے حد لذیذ تھا۔ اس حسین شام کی ملاقات نے ہجر کی چادر اوڑھے دونوں کو جدا ہونے پر مجبور کیا۔ یادوں کے خوشنما پھول سمیٹے وہ شملہ لوٹ آئی۔ دونوں کے درمیان گہری دوستی ہوئی، اکثر رات بھر بے شمار موضوعات پر تبادلۂ خیال ہوتا لیکن ذاتیات پر مبنی گفتگو سے دونوں ہی پرہیز کرتے۔ یوں وقت تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ اس دوران پروین کے والدین کا انتقال ہو گیا اور بھائی اپنے سسرال ممبئی شفٹ ہو گیا۔ پروین کی تقرری کسی کالج میں بطور پروفیسر ہوئی۔ ایک شام ڈور بیل پر پروین نے دروازہ کھولا تو سامنے معاذ کو پا کر حیران رہ گئی۔

"آپ۔۔۔۔؟"

"جی۔۔۔ میں" اس نے مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"سرپرائز، بنا کسی اطلاع؟"

"آفس کے کام سے شملہ آیا ہوں، سوچا اپنی دوست کی خیریت پوچھ آؤں۔"

"اچھا کیا۔۔۔ کچھ تو حوصلہ دکھایا"

"آپ چوٹ کر رہی ہیں؟"

"نہیں۔۔۔۔۔" پروین کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"گزشتہ ملاقات کو کتنا عرصہ گزر گیا لیکن ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کل ہی کی بات ہے" معاذ کے اس جملے پر پروین اداسی سے مسکرائی اور نہایت کرب انگیز لہجے میں کہنے لگی۔ "رب العالمین نے جھوٹ سے منع کیا ہے۔۔۔۔ پھر کیوں جھوٹ بولتے ہو۔۔۔؟ ہجر کی لمبی و سیاہ راتوں کو گن گن کر گزارا گیا ہے۔ یاسیت میں ڈوبی غزلوں کا ہر مصرع اس بات کا گواہ ہے!!" یہ سن کر معاذ دکھ سے مسکرایا۔ ڈھیر ساری باتیں انھوں نے دروازے پر کھڑے کھڑے ہی کر لی تھیں۔ شاید دونوں ہی اس ملاقات کے سحر میں تھے۔ باہر برف گر رہی تھی۔ پروین نے آتش دان میں لکڑیوں کو سلگایا۔ اس کے باوجود کمرے کی یخ بستہ خنکی میں کوئی فرق نہیں آ رہا تھا۔ شاید دونوں کے وجود میں ماضی برف بن کر جم گیا تھا۔

"آتش دان کے قریب اس صوفے پر بیٹھ جائیں" پروین نے آتش دان میں لکڑیوں کا اضافہ کرتے ہوئے اشارہ کیا۔ وہ اٹھا اور آتش دان کے قریب صوفے پر بیٹھ گیا۔ دونوں نے وہیں بیٹھ کر خاموشی سے ڈنر کیا۔ اس کے بعد پروین نے کافی بنائی اور کافی کی چسکیوں کے دوران

"شادی کے صرف چند ماہ بعد ہی اس نے مجھ سے خلع لے لیا تھا" پروین حیرت سے معاذ کو دیکھنے لگی۔ معاذ ایک قابل انسان تھا۔ دنیا کی ہر نعمت اور آسائش اس کے قدم چوم رہی تھی۔ بیوی کا خلع لینا یقیناً ایک معمہ تھا۔ کھانا، معاذ نے خود بنایا، جو بے حد لذیذ تھا۔ اس حسین شام کی ملاقات نے ہجر کی چادر اوڑھے دونوں کو جدا ہونے پر مجبور کیا۔ یادوں کے خوشنما پھول سمیٹے وہ شملہ لوٹ آئی

شاعری پر بات چیت ہونے لگی۔اشعار پر تبصرے بھی ہوئے لیکن ذرا سی دیر میں وہ پروین کی غزل گنگنانے لگا۔ پروین پر ایک سحر طاری ہوا۔ گویا خود کا کلام پہلی بار سن رہی تھی ہر لفظ دل اور روح کی گہرائیوں میں پیوست ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر، سلگتے وجود کے اطراف شاعری کی کئی کتابیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کتابوں سے کوئی کتاب اٹھا کر جب وہ معاذ کو دینے لگتی اس دوران لمس کا ننھا سا شبنمی قطرہ جو دل پر چھائے ریگستان کو چھو کر اسے سیراب کرنے کی کوشش کرتا۔ پروین جب شاعری سے اکتا گئی تو اس نے پہلو بدلتے ہوئے بنا کسی تمہید کے سوال داغا۔"شریک حیات کی یاد آتی ہے؟" پروین کے اچانک سوال پر معاذ چونکا۔"کچھ یادیں صرف یادیں نہیں بلکہ زندگی کا اثاثہ ہوتی ہیں جیسے آپ کے ساتھ گزرے مسوری کے وہ حسین لمحات! لیکن کچھ یادیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو سوائے درد اور زخموں کے کچھ نہیں دیتیں۔شریک حیات سے منسلک یادیں تو صرف زخموں سے پُر ناسور بنی ہوئی ہیں۔" پروین نے اسے غم کے دریا میں غوطہ زن پا کر نہیں چھیڑا اور چپ چاپ سنتی رہی۔

"بے وفا چاہتیں!" وہ اپنی زندگی کی کتاب کے اوراق پلٹتے ہوئے گہرے کرب سے بول رہا تھا۔ پروین دھیرے سے بھیگی پلکوں کی جھالر اٹھاتے ہوئے نم آواز میں گویا ہوئی۔

"چاہتیں کبھی بے وفا نہیں ہوسکتیں!"

"ممکن ہو۔۔۔لیکن میری بدنصیبی کہہ لیں کہ تقدیر کی سیاہی نے اس المیہ کو میری پیشانی پر پیوست کر دیا۔ آزمائش کی بھٹی میں جل رہا ہوں۔ایک آگ کا دریا ہے جس میں ڈوب چکا ہوں مگر اب دم گھٹ رہا ہے۔" معاذ کی آنکھیں چھلک گئیں۔ پروین بس خاموش نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی۔

"اختلاف اور نفرتیں زیادہ ہوں تو محبت کی دلیلیں کارآمد ثابت نہیں ہوتیں۔ایسے میں خاموشی کے دریا میں خود کو غرق کر دینا چاہیے نفرت اور اختلاف کی آگ خود بخود بجھ جاتی ہے سو میں نے خاموشی کی چادر تان لی، تقدیر کے فیصلوں کے آگے کبھی لب کشائی نہ کی لیکن اب تھک گیا ہوں" آتش دان کی دھیمی تپش محسوس کرتے ہوئے پروین نے پہلو بدلا اور نہایت سنجیدگی سے استفسار کیا۔

" علیحدگی کی کوئی وجہ ،کوئی سبب ؟ مناسب سمجھیں تو اس غم میں اپنا شریک بنائیں۔ کیونکہ دکھ بانٹنے سے کچھ کم ہوتے ہیں"

"صحت کے کچھ مسائل تھے" معاذ شرمندگی سے نظریں چرانے لگا۔

"اوہ۔۔۔!!" خوامخواہ اس نے معاذ کی دکھتی رگ پر انگلی رکھی تھی۔ شرمندگی محسوس کرنے لگی۔

" علاج کی کچھ ضرورت تھی سب ٹھیک ہوسکتا تھا لیکن اس نے انتظار نہ کیا اور صرف چند ہفتوں میں خلع کا تقاضہ کر لیا۔ دنیا کے سامنے مجھے اتنا رسوا کیا کہ میں کئی مہینوں تک اپنا چہرہ چھپائے بیٹھا رہا"

"اوہ!!!!!"

" پروین! تم بتاؤ ، تم نے شادی کیوں نہیں کی؟" معاذ آپ سے تم پر اتر آیا اور نہایت اپنائیت سے سوال کیا تھا۔ معاذ کے اس سوال پر پروین آہستہ سے اٹھی اور فریج سے پانی کی بوتل نکالنے لگی۔ پیاس سے اس کا گلہ خشک ہو رہا تھا۔ باہر برف میں تیزی آگئی تو پروین نے بوتل تھامے ہوئے آتش دان کے قریب پہنچ کر اس میں مزید لکڑیاں ڈال دی۔ کھڑکیوں کے گلاس پر کمرے کی حرارت اور باہر کی خنکی کے باعث بھاپ کے قطرے ایک عجب انداز میں رقص کرتے دکھائی دیے۔ خاموشی بوجھل ہونے لگی تو پروین نے بوتل کے اطراف انگلیوں کی گرفت تنگ کر لی۔ گلے کو تر کیے بنا جیسے خود کو سزا دیتی ہوئی معاذ کے سوال کا جواب دیتی گویا ہوئی۔

" زندگی میں کئی موقعے آئے۔۔۔ کئی ایک نے قدموں میں دل بچھایا۔۔۔ لیکن اس دل نے کہیں قرار نہ پایا۔ کیونکہ وہ کسی اور کی امانت تھا" معاذ خاموش دھڑکتے دل کے ساتھ سن رہا تھا۔ پروین کچھ توقف کے بعد سوز جگر میں ڈوبی آواز میں گویا ہوئی۔" آپ نے اپنے پڑوس میں کبھی ایک نگاہ بھی نہیں ڈالی۔۔۔ جبکہ میں گھنٹوں اسی امید میں کھڑی رہتی کہ وقت کا کوئی مہربان لمحہ ایسا ضرور آئے گا کہ آپ کی نگاہ کرم عنایت ہوگی۔۔۔ لیکن افسوس میرے خواب تو سراب تھے۔" پروین جیسے روح سے چمٹی ہجر کی چنگاریاں کو بجھانے کی کوشش کرتی، بوتل ہونٹوں سے لگا کر

"اختلاف اور نفرتیں زیادہ ہوں تو محبت کی دلیلیں کارآمد ثابت نہیں ہوتیں۔ایسے میں خاموشی کے دریا میں خود کو غرق کر دینا چاہیے نفرت اور اختلاف کی آگ خود بخود بجھ جاتی ہے سو میں نے خاموشی کی چادر تان لی، تقدیر کے فیصلوں کے آگے کبھی لب کشائی نہ کی لیکن اب تھک گیا ہوں"آتش دان کی دھیمی تپش محسوس کرتے ہوئے پروین نے پہلو بدلا اور نہایت سنجیدگی سے استفسار کیا۔

پانی پینے لگی۔ معاذ ہونقوں کی مانند دیکھتا رہا ایسا لگا جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ جب بوتل ختم ہوئی تو وہ ہولے ہولے رونے لگی۔ معاذ آہستہ سے اٹھا اور پروین کو تھام لیا۔

"یہ عجیب داستانِ محبت ہے۔ تم مجھے دن رات دیکھتی رہی، مجھ سے محبت کرتی رہی جبکہ میں تم کو بنا دیکھے، تم سے عشق کرنے لگا۔۔۔ تمھاری شاعری میری روح میں سرایت کر گئی" کچھ توقف کے بعد گہری سانس لیتا ہوا دوبارہ گویا ہوا۔

"تمام راز عیاں ہونے کے باوجود ہم ادھورے ہیں ادھوری محبتیں ہیں۔ کیونکہ ہماری تقدیر کا لکھا بھی ادھورا ہے! اگر ہم ایک ہوئے بھی تو شاید تمھاری تشنگی کم نہ ہوگی۔ ہوسکتا، نا آسودہ خواہشات تمھارے دامن میں ایسی محرومیاں اور قنوطیت بھر دیں، جس کے زیر اثر تم ہوش وخرد سے بیگانہ پاگل وحشی بن جاؤ۔ کیونکہ میں ایک ادھورا انسان ہوں میرے پاس زندگی کے رنگ کچے ہیں اور میں کچے رنگوں کی محبت کیسے کرسکتا ہوں بھلا؟!"

"یہاں کوئی مکمل نہیں ہر انسان کسی نہ کسی اعتبار سے ادھورا ہوتا ہے!" پروین نے سسکاری کے درمیان کہا۔

"پیار، محبت، عشق ان سب پر میرا کوئی حق اور اختیار نہیں۔" معاذ کی آواز بھرا گئی۔

"کون کہتا ہے؟" پروین ہولے سے چیخی

"یہ کہو کون نہیں کہتا؟" وہ کرب سے مسکرایا۔

"جب ہم نے اتنے سال ایک تصوراتی خاکے میں مقید ہو کر محبت کی، تو کیا اسے حقیقت پا کر محض ادھورا جان کر کنارہ کشی اختیار کر لیں؟ جبکہ زندگی نے ایک عرصے تک تہی دامن رکھا تو بھلا آگے کی کیا پرواہ کریں۔؟!" معاذ کی آنکھوں کے گوشے بھیگنے لگے۔

"فیصلے آسمان سے اتر رہے ہیں تو انھیں کسی دلائل سے شرمندہ نہ کریں!!!" پروین کی سسکاری ابھری۔ معاذ نے مسکرانے کی کوشش کی تو پروین نے آگے بڑھ کر اس کی پلکوں سے گرتے ہوئے آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں میں جذب کر لیے۔

"روح کی پیاس بجھانا چاہتی ہوں جو پتا نہیں کتنی صدیوں سے پیاسی ہے۔"

وقت کا فیصلہ ہے جو شاید ایک عرصے بعد ان کے قدموں سے خود ہی آ کر لپٹ گیا یا شاید محبت کے سمندر کی تیز لہریں، ویران جزیروں سے ٹکرا کر انھیں سیراب کرنا چاہتی تھیں۔ دونوں نے سوچا:

یادوں کی مزار پر دیپ جلا کر زیست کو روشنی بخشی نہیں جاسکتی بلکہ حقیقت کی پگڈنڈیوں پر شمع جلا کر زندگی میں اجالا ضرور پھیلایا جاسکتا ہے!

□□□

Nahid Tahir
W/O Abu tahir Ahmed
Project manager, Saudi ceramic co.
P. O.Box No#40487
Second industrial city
Alkharj road
RIYADH-11499.K.S.A

روبینہ ساگر روبی

کہاں تم چلے گئے

موسم نے رنگ بدلا تھا، برسات رخصت ہو رہی تھی، اور موسم سرما چپکے سے آ کر دستک دے چکا تھا، اور سرما نے آتے ہی ہر چیز کو اپنا سرد لباس پہنا دیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے قدرت نے اپنے سارے خوشنما رنگ آسمان پر بکھیر دیے ہوں۔ بلند و بالا شجر کی ڈالیوں پر بیٹھے رنگ برنگی حسین پرندے چہک رہے تھے تو کچھ پنچھی اپنے پروں کو سمیٹ کر اس سرد موسم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

وہ بھی موسم سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کانوں میں ایئر فون لگائے لان میں کرسی پر بیٹھی مزے سے جھوم رہی تھی، تیز ہواؤں کے جھونکے اس کے سلکی بالوں کو چوم رہے تھے۔ ڈور بیل کوئی چوتھی بار بجی تھی لیکن اس کے انہماک میں ذرہ برابر بھی کمی نہیں آئی تھی اور سارے ملازم بھی آج چھٹی پر تھے۔

”عینا کانوں میں ٹھونسے اسپیکر نکالو ورنہ کسی دن بہری ہو جاؤ گی۔ ڈور بیل کب سے بج رہی ہے، لیکن مجال ہے جو آپ کے کانوں پر جوں بھی رینگ جائے“۔ دادی جان کی تیز آواز پر اس نے ہڑبڑا کر اپنے کانوں سے ایئر فون کھینچے تھے اور ان کے غضبناک تیور دیکھ کر گھبرا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ”اب کھڑی کھڑی میرا منہ کیوں تک رہی ہو جاؤ جا کر دیکھو کون ہے دروازے پر۔ پتہ نہیں میرے بعد کیا ہوگا آپ کا، آنے دے مرتضیٰ کو آج ہی اس سے بات کرتی ہوں کہ جلد ہی آپ کی شادی کر دے، اس کے لاڈ پیار نے ہی آپ کو اتنا بگاڑ دیا ہے۔ میری بوڑھی ہڈیوں میں اب اتنی جان نہیں ہے کہ ہر دم آپ کی دیکھ بھال کرتی رہوں۔“ دادی جان غصے سے بڑبڑاتے ہوئے اندر چلی گئی تھی۔ اور وہ سرعت سے اندر جا کر سو کا نوٹ ہاتھ میں لے آئی تھی، ڈور بیل مسلسل بج رہی تھی۔ وہ تیز تیز چلتے دروازے کے قریب جا کر رک گئی تھی، اس کے خیال کے مطابق باہر شاید مانگنے والا ہوگا، ڈور بیل پھر بجی تھی اور اس کا خون کھول اٹھا تھا۔ ”رک جاؤ بدتمیز انسان کھول رہی ہوں صبر تو رکھو، تمھاری وجہ سے دادی جان نے مجھے اتنی باتیں سنائی ہیں۔“ جھنجھلا کر اس نے تھوڑا سا دروازہ کھولا تھا اور نوٹ والا ہاتھ آگے بڑھا کر بولی تھی۔ ”یہ لو پکڑو پیسے اور دفعہ ہو جاؤ یہاں سے۔“ اس نے زور سے دروازہ لگانا چاہا تھا۔ لیکن دوسری طرف بھی کوئی ڈھیٹ قسم کا انسان تھا، اگلے ہی پل وہ پوری طاقت سے دروازہ دھکیلتا ہوا اس کے سامنے تھا اور اس کی چیخ نکل گئی تھی۔ ” دادی جان دیکھیے یہ مانگنے والا زبردستی اندر آ گیا ہے۔“ اس کے چلانے پر دادی جان ہانپتی کانپتی باہر آئی تھی اور ڈاکٹر اریز مصطفیٰ پر نظر پڑتے ہی ان کے لب مسکرا اٹھے تھے۔ وہ انھیں سلام کرتا ہوا تیزی سے ان کی طرف بڑھ کر گلے لگ گیا تھا۔ ”عینا یہ آپ کے مصطفیٰ چاچو کا بیٹا اریز ہے، اور اس نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا تھا، جبکہ اریز شکایتی نظروں سے اسے گھور رہا تھا، اور اس نے جلدی سے اپنی نظروں کا زاویہ بدل لیا تھا وہ اپنی کچھ دیر والی حرکت پر بہت شرمندہ

تھی۔ اور پھر کچھ لمحوں بعد ہی وہ دادی کا ہاتھ تھامے اندر چلا گیا تھا، اور وہ اس کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔ ''اوہ تو یہ ہیں مصطفیٰ چاچو کا چارمنگ پرنس جس کی شخصیت اور ذہانت کے چرچے پورے خاندان میں مشہور تھے۔ مرتضیٰ خان نے اسے کل ہی بتایا تھا کہ اریز حال ہی میں کینسر اسپشلسٹ کی ڈگری لے کر انڈیا لوٹ آیا ہے اور اس شہر کے ہاسپٹل میں اس کی نوکری لگی ہے اور وہ یہیں رہے گا۔ عینا نے اسے بچپن میں دیکھا تھا اور جب سے اس کی ملاقات اب ہوئی تھی، مصطفیٰ چاچو زمینوں کی وجہ سے گاؤں میں ہی رہائش پذیر تھے اور مرتضیٰ خان نوکری کی وجہ سے یہیں شہر میں مقیم تھے، عینا ان کی اکلوتی اولاد تھی، اس کے بچپن میں ہی اس کی امی کا بیماری کی وجہ سے انتقال ہو گیا تھا۔ دادی جان کی گود میں ہی اس نے پرورش پائی تھی۔

سرسبز و شاداب درخت ہواؤں کے زور پر گنگناتے ہوئے جھوم رہے تھے۔ حوض کے کناروں پر بیٹھے پرندے شور مچا رہے تھے، اور غروب ہوتا ہوا آفتاب ان دونوں کو مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ عدل رحمٰن اسے کب سے منا رہا تھا لیکن وہ تھی کہ ایک ہی بات کی رٹ لگائے ہوئے تھی۔ وہ دونوں یونیورسٹی پارک کے ایک تنہا گوشے میں سنگی بینچ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ''دیکھو عدل آج آخری بار آپ سے کہہ رہی ہوں کہ پاپا سے مجھے مانگ لو ورنہ وہ میری شادی کہیں بھی کر دیں گے، پہلے سے ہی ان کا چہیتا بھتیجا ہمارے گھر میں موجود ہے۔'' اریز بہت خوبصورت تھا لیکن عدل رحمٰن اس سے کہیں زیادہ خوبصورت تھا شہزادوں جیسی شخصیت رکھنے والا۔ ''عینا میری بات سمجھنے کی کوشش کرو یار میرا یونیورسٹی میں یہ آخری سال ہے اس کے بعد میں باہر چلا جاؤں گا۔ صرف چند سال اور انتظار کر لو میں انکل کے سامنے تب ہی آؤں گا جب کچھ بن جاؤں گا۔ ابھی میں آپ کے پاپا کے معیار پر پورا نہیں اتروں گا۔ میں آپ کو ہر آسائش دینا چاہتا ہوں آپ عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کی عادی ہیں اور میرے پاس آپ کو دینے کے لیے سوائے محبت کے اور کچھ بھی نہیں'' وہ بہت نرمی سے اسے سمجھا رہا تھا۔ اور وہ بھڑک کر بولی تھی۔ ''اور مجھے آپ کی محبت کے سوا کچھ بھی نہیں چاہیے صرف آپ اور آپ کی محبت ہی میرے لیے کافی ہے۔ دولت کی بھوکی سمجھ رکھا ہے آپ نے بھی عدل رحمٰن اگر آپ کل پاپا سے میرا ہاتھ مانگنے نہیں آئے تو پھر کبھی بھی مجھ سے ملنے کی کوشش نہیں کرنا۔'' تلخی سے بولتے ہوئے وہ جانے کے لیے کھڑی ہوئی تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ بٹھا چکا تھا اور وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہ گئی تھی۔ عدل اسے پہلے سے بہت کمزور نظر آ رہا تھا۔ چہرے پر زردی گھلی ہوئی تھی اور اس کی سرمئی آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ چکے تھے، اس کی آنکھوں کو دیکھ کر محسوس ہو رہا تھا جیسے ان میں جلتے تمام دیے بجھ چکے ہوں، وہ برسوں کا بیمار لگ رہا تھا۔

''ٹھیک ہے یار غصہ چھوڑو خدمت کرو مجھے کچھ ٹائم دے دو ابھی میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں کچھ دنوں میں ضرور آپ کے گھر آؤں گا۔'' وہ ٹالنے کے انداز میں بولا جانے کیوں اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ ''کیا ہوا ہے عدل آپ کو۔'' وہ تشویش زدہ بولی تھی گھبراہٹ و بے چینی کے رنگ اس کے چہرے پر پھیل رہے تھے۔

''میرے ساتھ ابھی ہاسپٹل چلو، ہم ڈاکٹر کو دکھا آتے ہیں۔'' وہ عجلت سے کہتی ہوئی اس کا ہاتھ تھامے کھڑی ہو گئی تھی، اس کے دل میں برے خیال و ہول اٹھ رہے تھے، اور عدل جیسے اس کی بے تابی پر تڑپ اٹھا تھا۔'' ریلیکس عینا کچھ نہیں ہوا ہے مجھے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے بس میرے سر میں رہ رہ کر شدید درد اٹھتا ہے۔ ڈاکٹر کو دکھایا ہے میں نے میڈیسن شروع ہے میری میں ٹھیک ہو جاؤں گا آپ فکر نہ کریں''

''میرے ساتھ ابھی ہاسپٹل چلو، ہم ڈاکٹر کو دکھا آتے ہیں۔'' وہ عجلت سے کہتی ہوئی اس کا ہاتھ تھامے کھڑی ہو گئی تھی، اس کے دل میں برے خیال و ہول اٹھ رہے تھے، اور عدل جیسے اس کی بے تابی پر تڑپ اٹھا تھا۔ ''ریلیکس عینا کچھ نہیں ہوا ہے مجھے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے بس میرے سر میں رہ رہ کر شدید درد اٹھتا ہے۔ ڈاکٹر کو دکھایا ہے میں نے میڈیسن شروع ہے میری میں ٹھیک ہو جاؤں گا آپ فکر نہ کریں''۔ وہ نرمی سے اس کے گالوں کو تھپتھپاتا ہوا اس کو تسلی دے رہا تھا یا پھر خود کو دلاسہ ''یاد رکھنا عدل عینا کی جان صرف آپ میں بستی ہے۔ جلدی پاپا کے پاس آنا ورنہ آپ کی عینا مر جائے گی۔'' بھیگے لہجے میں بولتے ہوئے وہ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے چھڑا کر چلی گئی تھی۔ اور وہ حیران و پریشان سا اس جنونی لڑکی کو جاتا ہوا دیکھتا رہ گیا تھا۔ ''جاناں میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ مجھے...... کہ مجھے...... ہاں لیکن اب میں آپ سے بہت دور جانے والا ہوں۔'' وہ

بے بس سا کھڑا اپنے ہی حال پر پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔

مرتضٰی خان کی طبیعت اکثر خراب رہنے لگی تھی اور وہ اس کے لیے بہت فکر مند تھے وہ اسے جلد از جلد کسی مضبوط پناہوں میں سونپنا چاہتے تھے۔ اسی لیے وہ عدل کو پاپا سے ملانا چاہتی تھی لیکن اس کا نمبر مسلسل بند جا رہا تھا تین ہفتوں سے اس کی عدل سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی کوئی رابطہ ہو پایا تھا۔ وہ بہت پریشان تھی اس نے جھنجھلا کر موبائل کو پٹخ دیا تھا اور پھر وہ دوسرے دن ہی اس کے گھر پہنچ گئی تھی، لیکن اس کے گھر پر لاک لگا ہوا تھا۔ اس نے آس پاس کے لوگوں سے پوچھا تو پتا چلا کہ وہ دو ہفتے پہلے ہی یہ گھر بیچ کر جا چکا ہے اور وہ وہاں سے ناامید لوٹ آئی تھی۔ اتنا تو وہ جانتی تھی کہ عدل اکیلا رہتا تھا۔ اس کے والدین نہیں تھے، وہ پارٹ ٹائم جاب کر کے اپنی پڑھائی کا خرچ اٹھاتا تھا۔

> ’’بعض اوقات ہماری ساری کوششیں بے کار جاتی ہیں ہم جو چاہتے ہیں وہ ہو نہیں پاتا ہے بلکہ رب محمود جو چاہتا ہے وہ ہو جاتا ہے۔ چاہے ہمیں وہ پسند ہو یا نہ ہو اور عینا کے ساتھ بھی وہی ہوا تھا جو اس کے رب نے چاہا تھا۔ مرتضیٰ خان اس کی شادی ڈاکٹر اریز مصطفی کے ساتھ کر کے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔‘‘

بادلوں کے پردوں سے جھانکتا چاند بہت اداس تھا۔ یہاں بادلوں کا شرارتی ٹکڑا اس کے قریب آ کر اس کے چمکتے وجود کو ڈھانپ لیتا اور پھر کائنات پہ اندھیرا چھا جاتا، بادل اور چاند کی آنکھ مچولی کو تارے بہت محویت سے دیکھ رہے تھے۔

نیند عینا کی آنکھوں سے کہیں دور چلی گئی تھی، عدل ایک لمحے کے لیے بھی اس کے دل و دماغ سے محو نہیں ہو پا رہا تھا۔ آنسوؤں کو جیسے اس کی آنکھیں پسند آ گئی تھی۔ وہ اس سے تمام رابطے منقطع کر کے کہیں روپوش ہو گیا تھا۔ ’’عدل کیوں مجھے اکیلا چھوڑ کر چلے گئے، کیا قصور تھا میرا، کہاں چھپ کر بیٹھے ہو مجھ سے بے وفا ہرجائی انسان کیوں چلے گئے میری زندگی سے‘‘۔ روتے روتے وہ نڈھال سی وہیں بیڈ پر گر گئی تھی۔ ایسے ہی کئی دن اور کئی راتیں گزر گئیں تھی لیکن عدل کا کوئی پتا نہیں تھا۔ مرتضٰی خان کی طبیعت اور زیادہ خراب رہنے لگی تھی۔

بعض اوقات ہماری ساری کوششیں بے کار جاتی ہیں ہم جو چاہتے ہیں وہ ہو نہیں پاتا ہے بلکہ رب محمود جو چاہتا ہے وہ ہو جاتا ہے۔ چاہے ہمیں وہ پسند ہو یا نہ ہو اور عینا کے ساتھ بھی وہی ہوا تھا جو اس کے رب نے چاہا تھا۔ مرتضٰی خان اس کی شادی ڈاکٹر اریز مصطفیٰ کے ساتھ کر کے اپنے خالق حقیقی سے جا ملے تھے۔

’’عینا آج میرے اس مریض کا آپریشن ہے برین ٹیومر کا، جس کے بارے میں میں نے آپ کو کل بتایا تھا۔ وہ ساڑھے چار مہینے سے ہاسپٹل میں زیر علاج ہے۔ بیچارہ کب سے زندگی اور موت کے درمیان جھول رہا ہے اس نے اپنی بیماری کے علاج کے لیے اپنا گھر تک بیچ دیا ہے۔ ہماری پوری ٹیم اس کے کامیاب آپریشن کے لیے دعا گو ہے آپ بھی اس کے لیے دعا کرنا خدا رحمٰن کو شفا عطا کرے اور وہ جلدی صحت یاب ہو جائیں۔‘‘ وہ قرآن پاک کی تلاوت کر کے اسے جزدان میں لپیٹ کر رکھ ہی رہی تھی جب اریز عجلت میں بولتا ہوا اس کے قریب آ کر رکا تھا اور پھر اسی تیزی سے ہاسپٹل جانے کے لیے باہر نکل چکا تھا۔ عینا کا دل پتہ نہیں کیوں بہت گھبرا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے کوئی اپنا اس سے بہت دور جا رہا ہے اس کی کیفیت عجیب سی ہو رہی تھی۔ اریز کی اور اس کی شادی کو چار ماہ ہو چکے تھے۔ دادی جان کو مصطفیٰ چاچو اپنے ساتھ گاؤں لے گئے تھے۔ اریز کا زیادہ وقت ہاسپٹل میں گزرتا اور وہ سارا دن خاموشی سے گھر کے کاموں میں الجھی رہتی تھی اداس گم صم سی، اس کے لب سل گئے تھے۔ اس کی ہنسی، شرارتیں اور شوخیاں مرتضٰی خان کے جاتے ہی ختم ہو گئیں تھیں۔ لیکن کبھی کبھار اچانک عدل رحمٰن کی یاد اسے پاگل کر دیتی تھی، وہ یادجاناں سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی لیکن ایسا ممکن ہی نہیں تھا، جسم اور جان کبھی الگ نہیں ہو پاتے ہیں۔

شام نے اپنی زلفیں کھول دی تھیں، اور آہستہ آہستہ ہر چیز پر اپنا ڈیرہ جما رہی تھی، پنچھیوں کے جھنڈ بہت خاموشی سے اپنے گھروں کو واپس جا رہے تھے، جہاں گھونسلوں میں بیٹھے ان کے ننھے منے معصوم بچے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ زرد سوکھے بے جان پتے اس کے قدموں کے نیچے چرمرا کر دم توڑ رہے تھے۔ اور وہ ان خزاں رسیدہ پتوں کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی اور انھیں دیکھ کر سوچ رہی تھی کبھی ان پر بھی بہاریں گزری ہوں گی میری طرح لیکن بہاریں ہر کسی کے لیے لوٹ کر نہیں آتی خزاؤں کے موسم

ہی ہمیشہ ان کا مقدر بن جاتے ہیں۔وہ گہری سانس بھرتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی آئی تھی اور تمام کھڑکیوں کے پٹ کھول دیے تھے،ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے اندر آ رہے تھے لیکن پھر بھی اس کے اندر کی گھٹن کم نہیں ہو رہی تھی۔اسی پل اریز تھکا ہوا نڈھال قدموں سے اندر داخل ہوا تھا اور اس پر نظر پڑتے ہی وہ بے تابی سے اس کی طرف بڑھی تھی۔"کیا ہوا اریز آپ شاید بہت روئے ہیں۔" اس کی سرخ آنکھیں دیکھ کر اس نے پوچھا تھا۔"ہاں بہت رویا ہوں میں آج۔عینا، رحمٰن گزر گیا آپریشن کے دوران ہی اس نے دم توڑ دیا اور ہم اپنی کوششوں میں ناکام رہ گئے اور وہ اپنے پروردگار کے پاس جا چکا ہے۔مجھے اس سے ایک انسیت سی ہو گئی تھی۔وہ بہت عظیم شخص تھا، مجھے اس کی موت کا بہت دکھ ہے۔یقین نہیں آتا کہ وہ مر چکا ہے۔لیکن عدل رحمٰن بہت دور چلا گیا عینا عدل رحمٰن بہت دور چلا گیا۔" وہ گلوگیر لہجے میں بولتا ہوا وہاں سے چلا گیا تھا اور اس کے کانوں کے قریب جیسے کوئی بم بلاسٹ ہوا تھا۔اریز کے منہ سے نکلنے والے لفظوں نے اسے چکرا کر رکھ دیا تھا۔ایک ہی جملہ اس کے اردگرد گشت کر رہا تھا۔"عدل رحمٰن بہت دور چلا گیا عینا، عدل رحمٰن بہت دور چلا گیا۔" اریز نے اس کا پورا نام لے کر اس کے یقین پر مہر لگا دی تھی۔اس کے چہرے کا رنگ پل میں بدلا ہوا تھا، حزن و ملال اس کی آنکھوں میں پھیل رہا تھا، آنسوں اس کی پلکوں کی باڑ توڑ کر بنا رکے بہہ رہے تھے، اور وہ انھیں زور زور سے رگڑ رہی تھی۔کڑیاں سے کڑیاں ملتی گئی تھی اور اسے اپنے سارے سوالوں کے جواب مل چکے تھے۔عدل کا اسے یوں ٹالنا، اس سے سارے سلسلے توڑ دینا اور پھر اچانک اس کی زندگی سے غائب ہو جانا۔عینا کو ساری گزری باتیں یاد آ گئیں تھی عدل کے سر میں اٹھتی درد کی ٹیسیں اس کا کمزور وجود اور چہرے پر زردی وہ اپنی بیماری کے بارے میں جانتا تھا لیکن اس سے سب چھپا گیا تھا۔کیونکہ وہ عینا کو اپنے لیے مرتا ہوا نہیں دیکھ سکتا تھا۔اسے پتا تھا کہ وہ اس کے برین ٹیومر کی خبر سنے گی تو شاید مر جائے گی۔بس یہی سب سوچ کر اس نے خود کو عینا سے دور کر لیا تھا اریز کا مریض رحمٰن کوئی اور نہیں بلکہ عینا کا عدل رحمٰن ہی تھا۔

چاند کا پرنور پاکیزہ اجالا فسوں پھیلا رہا تھا۔اس کی اجلی سفید دودھیائی کرنیں بہت حسین لگ رہی تھی، درخت اس کی ٹھنڈی روشنی میں ہولے ہولے جھوم رہے تھے آسمان دمکتے چاند اور خوبصورت چمکتے ستاروں کے ساتھ اپنے حسن پر نازاں تھا اور عینا چاند ستاروں کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھی ہوئی تھیں۔اس کی سپاٹ ویران آنکھیں جانے کب سے آسمان کو ہی تکے جا رہی تھی اریز گہری نیند سو رہا تھا، اور وہ یہاں بیٹھی غموں کے ساتھ رتجگا منا رہی تھی۔یونہی اچانک اس کی تھکی ہوئی آنکھوں میں دل کی محبت ہلکورے لیتی تھی۔بھولی بھٹکی صدائیں تھیں جو بہت دور سے آتی تھی اور اسے اپنی طرف بلاتی تھی۔لیکن عدل تو وہاں چلا گیا تھا جہاں کوئی صدا جاتی ہے نہ آتی ہے۔سفید بگلوں کا جھنڈ پھڑ پھڑاتے ہوئے آسمان کے نیچے سے گزر رہا تھا اور پھر اس کی نظروں سے اوجھل ہوتا ہوا بہت دور نکل گیا تھا اور عینا کے زخمی دل سے یہی صدائیں آ رہی تھی۔"عدل رحمٰن لوٹ آؤ کہاں چلے گئے آپ، کیوں چلے گئے، لوٹ آؤ، کہاں چلے گئے۔" اس کی تڑپتی سسکتی صدائیں دل کے ویرانوں میں گونج رہی تھی۔

❑❑❑

Ms. Rubina Sagar Rubi
D/o. Shaikh Bilal Sagar
Hirapura, Near Darus Salam
Achalpur City
Dist. Amravati-444806 (M.S)

نازیہ ناز

رنگ اپنا زمانہ بدلتا رہا　　میرا ارمان دل میں مچلتا رہا

ڈس رہی تھیں ادھر مجھ کو تنہائیاں　　اور اُدھر بزم میں دور چلتا رہا

مجھ کو احساس بھی نہ ہوا دوستو　　آستیں میں مرے سانپ پلتا رہا

ان کی یادوں سے محفل کی رونق بڑھی　　جھوٹے وعدوں سے دل بھی بہلتا رہا

عشق کی راہ میں اس کی قیمت نہیں　　موسموں کی طرح جو بدلتا رہا

ناز اُدھر بھی پریشانیاں تھیں اِدھر
حسرتوں کا جنازہ نکلتا رہا

Nazia Parveen
W/o. Arif Nasir
259 D, Nayyar Manzil
Flat No. 2020, Jamia Nagar
New Delhi-110025

نظمیں

آبگینہ عارف

دیوی

دیوی ہوں میں
کتنی بار توڑو گے؟
پھر جوڑو گے
پھر پوجو گے
کب جانو گے؟
کب مانو گے؟
کیوں مٹّی ہوں میں؟
یہ ''دیوی''
زندہ دیوی ہے
ایک دل بھی یہاں دھڑکتا ہے
مت پھول چڑھاؤ
تم مجھ پر
مت گیت سناؤ
تم مجھ کو
بس ''مجھ'' کو
مجھ ہی رہنے دو
''میں'' زندہ ہوں
یہ کہنے دو

خودی

خود سے کہنا
نہیں کہنا ہے
جیسے پانی کو
پتھر سمجھوں
جیسے پھولوں میں
کانٹوں کی چُبھن
جس پہ سو جاؤں میں
ایک ایسی چُبھن
بند آنکھوں میں
پانی کے کنکر
ریزہ ریزہ
لہو میں سرایت کرتی
خودی...... رُکا ہوا پانی
یا راہ کا پتھر
کیا سب کو بہا دوں
کسی گنگا میں
یا خالی روشن دانوں میں سجاؤں؟
کیسے سارے پتّھر
مجھ جیسے لگنے لگے
کیسے...؟

Abgeena Arif
C-5 Jasola Village
New Delhi-25
abgeena.jmi@gmail.com

لذیذ پکوان

میکرونی رول بنانے کی ترکیب

اجزا: میکرونی ایک کپ، چیڈر چیز (کش کیا ہوا) 1 کپ، پیاز (باریک کٹی ہوئی) ایک عدد (درمیانی)، ہری مرچ (باریک کٹی ہوئی) 4-5 عدد، گرم مصالحہ (پاؤڈر) 1 چائے کا چمچ، نمک حسب ذائقہ، 7 ہرا دھنیا (باریک کٹا ہوا) حسب ذائقہ، 8 انڈے دو عدد، 9 بریڈ کرمز حسب ضرورت، 10 میدہ حسب ضرورت، تیل تلنے کے لیے

تیار کرنے کی ترکیب: میکرونی کو فوڈ پروسیسر میں ڈال کر اچھی طرح گرائنڈ کرلیں۔ چیڈر چیز، ہری مرچ، پیاز، ہرا دھنیا کو بھی ساتھ ہی گرائنڈ کرلیں۔ ایک برتن میں اس مرکب کو ڈالیں۔ اس میں نمک، کالی مرچ پاؤڈر، گرم مصالحہ پاؤڈر، زیرہ پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح مکس کرلیں۔ ہتھیلی پر ہلکا سا تیل لگا کر ان کو رولز کی شکل دیں اور ریفریجریٹر میں 15-20 منٹ کے لیے رکھ دیں۔ انڈے پھینٹ لیں ان کو پہلے میدے، پھر انڈے پھر بریڈ کرمز میں اچھی طرح رول کرلیں۔ تیل گرم کریں اور رولز کو تیل میں ڈیپ فرائی کرلیں۔ گولڈن ہونے پر نکالیں۔ ٹماٹر کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔

بچوں کے لیے لذیذ کھیر

اجزا: دودھ آدھا لیٹر، چینی 50 گرام، شکر قند 50 گرام، کھویا 25 گرام، پستہ چار عدد، بادام کی گریاں چھ عدد، روح کیوڑہ دو قطرہ

طریقہ: سب سے پہلے بادام کی گریاں گرم پانی میں بھگو کر چھلکا اتاریں اور گریاں باریک پیس لیں۔ پستے کی گریاں بھی باریک پیس لیں،

شکر قندی ابال کر چھیلیں اور باریک کچل لیں اس کے بعد ایک برتن میں دودھ ڈال کر چولہے پر رکھیں اور ہلکی آنچ پر ابالیں جب دودھ ابلنے لگے تو اس میں کچلی ہوئی شکر قندی ڈال کر چمچ سے مکس کریں تین منٹ کے بعد چینی ڈالیں اور مزید پانچ منٹ تک پکانے کے بعد کھویا مسل کر ڈال دیں اور جب کھیر گاڑھی ہونے لگے تو اس میں پسے ہوئے بادام اور پستے کی گریاں ڈال دیں چند منٹ کے بعد چولہے سے نیچے اتاریں کیوڑہ چھڑک کر ملائیں اور پلیٹ میں ڈال کر ٹھنڈی کریں اس کے بعد بچوں کو کھلائیں بچے اس قسم کی غذائیں کھانے کے شوقین ہوتے ہیں اس لیے بچوں کو گھر میں اس طرح کی غذائیں پکا کر کھلایا کریں۔

انڈا کباب بنانے کی ترکیب

اجزا: آلو 250 گرام، پیاز ایک عدد، انڈا ایک عدد، سیاہ مرچ پاؤڈر ایک چائے کا چمچہ، ہری پیاز ایک عدد، نمک حسب ذائقہ، بیکنگ پاؤڈر ایک چٹکی، تیل حسب ضرورت

تیار کرنے کی ترکیب آلو اور پیاز کو چھیل کر کدوش کر لیں۔2 ہری پیاز کو باریک چوپ کریں۔آلوؤں میں پیاز، ہری پیاز، نمک، سیاہ مرچ پاؤڈر، بیکنگ پاؤڈر اور انڈا ڈال کر اچھی طرح سے مکس کریں۔فرائنگ پین میں تیل گرم کر کے اس آمیزے کو چمچے سے کباب کی شکل میں ڈالیں۔دونوں طرف سے گولڈن ہونے تک فرائی کریں۔کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔

سبزی کے پکوڑے بنانے کی ترکیب

اجزا: آلو دھو کر اور چھیل کر مٹر کے دانوں کے برابر کاٹ لیں۔ گوبھی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس طرح کاٹیں کہ بالکل پھول لگیں۔ کاٹنے کے بجائے ہاتھوں سے بھی توڑ سکتے ہیں۔پھر ڈنٹھل کو چھری سے آلوؤں کی طرح کاٹ لیں۔بینگن دھو کر چھیل لیں اور چھوٹے ٹکڑے کاٹ لیں۔ ایک دو پیاز باریک کاٹ لیں (موٹے قیمے کی طرح)۔ بند گوبھی کے تھوڑے سے لچھے کاٹ لیں۔ ہرا دھنیا، پودینہ، اور سبز مرچیں مرضی کے مطابق مقدار میں کاٹ لیں۔

تیار کرنے کی ترکیب: تمام تیار کی ہوئی سبزیاں ملالیں۔مرضی کے مطابق سرخ مرچ اور نمک ڈال کر ہلائیں۔بیسن چھان کر سبزیوں میں صرف اتنا ملائیں جس سے سبزیوں پر ہلکا سا پلستر ہی ہو۔زیادہ بیسن ڈالنے سے پکوڑے سخت ہوں گے۔اگر بیسن لگائی ہوئی سبزیاں آدھ کلو کے برابر ہے تو ان میں ایک درمیانہ چمچ ہلکے گرم گھی کا ڈال لیں۔ساتھ ہی ایک چمچ میدہ بھی ملالیں۔ایک چھوٹی سی چٹکی بیکنگ پاؤڈر یا میٹھے سوڈے کا ڈال لیں۔پھر پکوڑوں کی اس ملاوٹ کو خوب پھینٹیں۔اگر ضرورت ہو تو پانی کا چھینٹا دے کر پھینٹیں۔لیکن زیادہ پانی نہیں ڈالنا صرف اتنا جس سے یہ ماوا بہت سخت نہ رہے۔اب تیل یا گھی میں درمیانی آنچ پر پکوڑے تلیں۔

نوٹ: پکوڑے تلتے وقت اس بات کا خیال رکھیے کہ تیل یا گھی خوب گرم ہو۔پہلے آنچ تیز ہو بعد میں دھیمی اس طرح سبزیاں نرم ہوجائیں گی۔ایک اور بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ ایک وقت میں زیادہ پکوڑے نہ تلیں صرف اتنے پکوڑے گھی میں ڈالیں جو تیل یا گھی میں دور دور بکھرے ہوئے ہوں۔

(بحوالہ:www.urdupoint.com)

□□□

مشکور احمد

اسباب مرض

(Causes of Disease)

مرض کا تصور

(Concept of Disease)

مرض کی تعریف کرنے کی بہت سی کوششیں کی گئی ہیں۔ Webster کے مطابق مرض وہ حالت ہے جس میں جسمانی صحت میں خلل واقع ہوجاتا ہے۔ یا پھر صحت کسی بھی طرح کم ہوجاتی ہے یا وہ حالات جس میں جسم میں کوئی بھی ایسی تبدیلی پیدا ہو جس کی وجہ سے اہم افعال میں خلل واقع ہوجائے۔ آکسفورڈ انگریزی لغت کے مطابق مرض جسم یا جسم کے کسی عضو کی وہ حالت ہے جس میں اس کے افعال میں خلل واقع ہو۔ آسان زبان میں کہا جاسکتا ہے کہ مرض صحت کی منفی حالت ہے یعنی جسمانی ودماغی صحت میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کا واقع ہونا جس کی وجہ سے طبعی افعال میں خلل واقع ہوجائے مرض کہلاتا ہے۔ مرض کی یہ تمام تعریفیں نامکمل تصور کی جاتی ہیں کیونکہ ان سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ مرض کی ابتدا کب ہوئی اور اس حالت کی شناخت کیسے کی جائے، اور نہ ہی ان سے مرض کی شدت کا پتہ لگایا جاسکتا ہے۔

عالمی ادارۂ صحت نے صرف صحت کی تعریف بیان کی ہے، مرض کی نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مرض کے بہت سے درجات ہیں۔ امراض کبھی Subclinical ہوتے ہیں اور کبھی شدید۔ اس کے علاوہ کچھ امراض میں حاد (Acute) کیفیت پائی جاتی ہے، اور کچھ میں مزمن (Chronic) علامات پائی جاتی ہیں۔ کچھ کی مدت کم ہوتی ہے اور کچھ کی مدت زیادہ۔ بعض امراض میں حالت مرض اور حالت صحت کا اندازہ لگانا آسان ہوتا ہے مثلاً حمیات، لیکن بعض امراض میں طبعی وغیر طبعی کا اندازہ آسانی سے نہیں کیا جاسکتا مثلاً ذیابیطس۔ اس کے علاوہ مرض کا اختتام بھی الگ الگ ہوتا ہے مثلاً مکمل صحت، معذوری یا موت کی شکل میں۔ اس ضمن میں Disease کے معنی ہیں، جسمانی یا نفسانی غیر طبعی حالت جب کہ بیماری (Illness) کا اطلاق مریض کے احساسات پر ہوتا ہے جو مرض کی وجہ سے اسے محسوس ہوتا ہے۔ Sickness کا تعلق انسان کی سماجی زندگی سے ہے کیونکہ مریض اپنی سماجی ذمہ داریاں مکمل طور پر نہیں پوری کرسکتا۔

امراض کا جراثیمی نظریہ

(Germ Theory of Disease)

اس کی ابتدا 1860 میں ہوئی جب فرانس کے Louis Pasteur نے ہوا میں جراثیم کی موجودگی کا ثبوت پیش کیا۔ اس کے بعد متعدد جراثیم دریافت ہوئے۔ چنانچہ 1873 میں امراض کا جراثیمی نظریہ وجود میں آیا۔ اس زمانے میں دیگر تمام اسباب مرض سے قطع نظر صرف جراثیم اور تعدیہ کو اہمیت دی جانے لگی۔ چنانچہ 19 ویں اور 20 ویں صدی میں صرف یہی تصور جاری رہا۔ جراثیمی نظریہ کے مطابق مرض وسبب میں براہ راست تعلق ہے۔ یعنی سبب جب ایک انسان کے تعلق میں آتا ہے تو

مرض پیدا ہوتا ہے۔

حالانکہ اس زمانہ میں ان باتوں کو بہت سراہا گیا لیکن اس کی وجہ سے امراض کے دیگر اسباب سے بے خبری بھی پیدا ہوئی۔ اس زمانے میں محققین نے جراثیمی نظریہ کے علاوہ کسی سبب پر غور وفکر کرنے کو غیر ضروری سمجھا۔ جب کہ فی زمانہ یہ معلوم ہے کہ مرض کسی ایک سبب سے نہیں بلکہ متعدد اسباب کے اشتراک سے پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ سب اس میں اہم ہوتے ہیں چنانچہ موجودہ زمانہ میں صرف جراثیم وتعدیہ کو ہی ساری اہمیت نہیں دی جاتی ہے۔

اپی ڈیمیولوجیکل مثلث (Epidemiological Triad)

امراض کے جراثیمی نظریہ میں چند کمیاں ہیں مثلاً یہ روشن حقیقت ہے کہ دق کے مریض سے قریب رہنے والے انسان کو دق کا مرض لاحق ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ہر وہ انسان جس کو B- Haemlytic Streptococcus کا تعدیہ ہوا اسے حاد Rheumatic Fever نہیں پیدا ہوتا۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسان کے ماحول میں بعض دوسرے اسباب بھی ہیں۔ جن سے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ اسباب مرض کے نظریہ کو وسعت دی جائے جس کے نتیجہ میں مندرجہ ذیل مثلث وجود میں آیا۔

ماحول

میزبان سبب مرض

(میزبان یعنی وہ انسان جو مرض قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو)

ماحول، سبب مرض، اور میزبان پر مشتمل یہ مثلث عرصۂ دراز سے اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے نتیجے میں ماہرین کو امراض کے مختلف اسباب پر غور وفکر کرنے میں مدد ملتی ہے، خصوصاً امراض متعدیہ میں۔

اسباب کا تانہ بانہ (Web of Causation)

اس تصور کو اولاً Mac Mohan اور Pugh نے اپنی کتاب Epidemiological Principles & Methods میں پیش کیا تھا۔ یہ تصور خصوصاً مزمن امراض کو سمجھنے میں زیادہ معاون ہے جہاں مرض کا سبب ایک نہیں ہوتا، بلکہ متعدد اسباب کے اشتراک سے مرض پیدا ہوتا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ یہ تمام اسباب مل کر ایک جال جیسا بنا لیتے ہیں اور ان کے درمیان پیچیدہ فعل وانفعال، مرض کا سبب ہوتا ہے۔ Epidemiology میں بنیادی طور پر انہی تمام اسباب کو مشترکہ طور پر سمجھنے اور پڑھنے کو اہمیت دی جاتی ہے۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ ایسی کون سی تدابیر اختیار کی جائیں جو ایک ساتھ متعدد اسباب کی کاٹ کر سکیں۔

Web of Causation کے تصور کے اعتبار سے یہ ضروری نہیں ہے کہ مرض سے تحفظ کے لیے ان تمام اسباب کو بیک وقت کنٹرول کیا جائے بلکہ بعض اوقات صرف کسی ایک سبب کو قابو میں کرنے سے بقیہ اسباب کا آپسی تعلق قطع ہو جاتا ہے جو تحفظ میں مددگار ہوتا ہے۔

امراض کے متعدد اسباب
(Multifactorial Causes)

ایک مرض کی پیدائش کے متعدد اسباب ذمہ دار ہوتے ہیں ابتدا میں میونخ کے Pettenkofer (1819-1901) نے اس تصور کو پیش کیا لیکن اس زمانے میں جراثیمی نظریات کے حاوی ہونے کی وجہ سے اس پر زیادہ دھیان نہیں دیا گیا۔

صحت عامہ، مانع جراثیم ادویہ اور Vector Control کی وجہ سے جب امراض متعدیہ کی شرح نسبتاً کم ہونے لگی تو دیگر طرز زندگی سے متعلق بیماریاں (Lifestyle diseases) بڑھنی شروع ہو گئیں۔ ان امراض کا سبب بیان کرنے میں امراض کا جراثیمی نظریہ ناکام تھا۔ اس طرح ان کو علاحدہ رکھنے (Isolation)، قرنطینہ یا صفائی وغیرہ سے بھی نہیں کنٹرول کیا جا سکتا تھا چنانچہ یہ تصور پیدا ہوا کہ ہر مرض کے لیے کسی ایک سبب کو ذمہ دار ٹھہرانا مناسب نہیں ہے۔ بعض امراض میں سماجی، معاشی، موروثی، اور نفسانی اسباب ذمہ دار ہوتے ہیں۔ جن کی اہمیت بقیہ اسباب کے برابر ہوتی ہے مثلاً دق صرف جراثیمی تعدیہ ہی سے نہیں پیدا ہوتی بلکہ غربت، بھیڑ بھاڑ، نقص تغذیہ، وغیرہ بھی اس مرض کی افزائش میں معاون ہوتے ہیں۔ چنانچہ کسی مرض کے لیے صرف ایک سبب، متعدی امراض کی پیدائش میں بھی ممکن نہیں ہے بلکہ چند اور اسباب کی موجودگی بھی ضروری ہے۔

موجودہ دور میں ثابت ہو چکا ہے کہ بعض امراض مثلاً سرطان متعدد اسباب کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں جیسے شحم کا زیادہ استعمال، سگریٹ نوشی، ریاضت کی کمی، فربہی وغیرہ یہ تمام Coronary heart disease کے ہونے میں بھی معاون ہوتے ہیں اور ان اسباب میں سے زیادہ تر انسان کی روز مرّہ کی زندگی اور اس کی عادات سے متعلق ہیں۔ چنانچہ موجودہ دور میں اطبا امراض کے جراثیمی نظریہ کے علاوہ انسان کی مکمل زندگی اور اس کی سماجی حیثیت اور صحت پر اس کے اثرات کی تحقیق میں مصروف ہیں۔ لہٰذا اسباب مرض کو سمجھنے کے لیے اسباب کے مختلف ماڈل بنائے گئے ہیں۔

Web of اور Mutifactorial Causes

Causation وغیرہ ان تمام ماڈل میں بجائے ایک سبب مرض کے، مریض اور ماحول کے تعامل (Interaction) کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ چنانچہ بہت سے Epidemiologist سبب مرض کو بھی ماحول ہی کا حصہ تصور کرتے ہیں۔ ان متعدد اسباب کو یکجا کرنے کا مقصد ان کی اہمیت کو واضح کرنا ہے تاکہ مرض کے تحفظ اور کنٹرول میں معاونت حاصل ہو۔ اس کے علاوہ متعدد اسباب کی معلومات ہونے سے ایک ہی مرض سے تحفظ کرنے کی مختلف تدابیر پر غور وفکر کیا جاسکتا ہے۔

اسباب مرض کی خصوصیات

(Agent factors)

ارسال مرض میں سب سے پہلی کڑی سبب مرض ہے۔ سبب وہ مادی یا غیر مادی، جاندار یا بے جان یا کوئی بھی وہ داخلی وخارجی طاقت ہے جس کی موجودگی یا کمی سے مرض کی پیدائش میں معاونت ہو یا براہ راست مرض واقع ہو۔ کسی بھی مرض میں سبب ایک بھی ہوسکتا ہے یا متعدد اسباب بھی ہوسکتے ہیں جن کی موجودگی یا آپسی ردعمل مرض کا باعث ہوتا ہے۔

اسباب مرض کو مندرجہ ذیل قسموں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

1۔ حیاتیاتی اسباب (Biological Agents)

یہ جاندار اسباب ہوتے ہیں جو مرض کا باعث ہوتے ہیں مثلاً Bacteria & Metazoa, Protozoa, Virus Fungus وغیرہ یہ تمام Organism ماحول کے سازگار ہوتے ہی انسان پر اپنا اثر دکھاتے ہیں اور مرضی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔

2۔ غذائی اسباب (Nutrient Agent)

اس میں لحمیات، شحمیات، نشاستہ، حیاتین، معدنیات اور پانی وغیرہ آتے ہیں۔ جن کی کمی یا زیادتی دونوں ہی باعث مرض ہوتے ہیں۔ تغذیہ کی کمی سے نقص تغذیہ کے امراض پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً قلت الدم اور زیادتی سے فربہی جیسے امراض پیدا ہوتے ہیں۔

3۔ طبعی اسباب (Physical Agent)

اس میں گرمی، سردی، نمی، خشکی، فضائی دباؤ، شعاعیں یا شور وغیرہ شامل ہیں، جو اپنی زیادتی یا کمی کی وجہ سے سبب مرض ہوسکتے ہیں۔

4۔ کیمیاوی اسباب (Chemical Agents)

ایسے داخلی وخارجی اسباب جن کی موجودگی بدن انسان کے لیے مضر صحت ہوتی ہے جیسے دھواں، دھول، قاتل جراثیم اشیا اور داخلی طور پر Ketones, Uric Acid وغیرہ۔ انھیں دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

(I) اندرونی (Endogenous)

(II) بیرونی (Exogenous)

(I) اندرونی (Endogenous)

بہت سے Chemical agents جسم انسانی میں اندرونی طور پر اعضا کو متاثر کرتے ہیں اور مرض کا باعث بنتے ہیں جیسے "Islet of langerhans" کے متاثر ہونے پر Diabetes کا ہونا یا گردوں کے متاثر ہونے پر acidosis کا ہونا یا urea کے متاثر ہونے پر Uraemia کا ہونا۔

(II) بیرونی (Exogenous)

بہت سے Chemical agents ایسے ہوتے ہیں جو بیرونی طور پر اعضا کو متاثر کرتے ہیں مثلاً ہوائی اثرات، بخارات، دھول یہ اجزا جسم انسانی میں سانس کے ذریعہ داخل ہوجاتے ہیں اور اعضائے تنفس کو متاثر کرسکتے ہیں۔

5۔ میکانیکی اسباب (Mechanical Agents)

اس میں خارجی اثر سے پیدا ہونے والی جراحتیں، ضربہ و سقطہ، کسر و بیرونی چوٹیں وغیرہ شامل ہیں۔

6۔ صحت کے لیے ذمہ دار اسباب کی کمی یا زیادتی (Abscence or insufficiency / Excess of a factor necessary to Health)

مثلاً کیمیاوی اسباب جیسے ہارمون، غذائی اسباب جیسے قلت الدم یا فربہی وغیرہ، کسی عضو کا نہ ہونا، کروموسومز کے تعلق سے اسباب، مناعت کے اسباب وغیرہ۔

7۔ سماجی اسباب (Social Agents)

سماجی اسباب مثلاً غربت، غیر طبعی طرز زندگی، تنہائی، والدین کی غیر موجودگی وغیرہ بھی بہت سے امراض کا سبب ہوتے ہیں اور فی زمانہ ان اسباب کی اہمیت کو تسلیم کیا جارہا ہے۔

8۔ میزبان اسباب (Host Factors)

وہ داخلی اسباب جو مرض پیدا کرنے میں معاون ہوتے ہیں۔ جدید اصطلاحات کے مطابق انسان کو زمین اور سبب مرض کو تخم سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ زیادہ تر امراض میں انسان کے جسم کی حالت مرض کی پیدائش اور اس کے انداز میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ ان اسباب کو مندرجہ ذیل قسموں میں بیان کیا جاتا ہے۔

i۔ آبادیاتی اسباب: جیسے عمر، جنس، اور رہائش وغیرہ۔

ii۔حیاتیاتی اسباب: جیسے موروثی، مناعت، بلڈ گروپ، اور طبعی افعال وغیرہ۔

iii۔سماجی ومعاشی اسباب: جیسے معاشی حالت، تعلیم، پیشہ وگھر وغیرہ۔

iv۔ طرز زندگی: جیسے سگریٹ نوشی، ریاضت، تغذیہ، اور شراب نوشی وغیرہ۔

اکثر حالات میں ایک مرض کے لیے بہت سے اسباب معاون پائے جاتے ہیں اور الگ الگ مریضوں میں ان اسباب میں مماثلت پائی جاتی ہے تاکہ اس سے مرض کی شناخت اور تحفظ کے بارے میں معلومات فراہم ہو سکیں۔

حیاتیاتی ماحول (Biological Environment)

یہ انسان کا وہ ماحول ہے جو جانداروں پر مشتمل ہے جس میں انسان خود بھی شامل ہے۔ ان جانداروں میں وائرس و دیگر جراثیم، کیڑے مکوڑے، کترنے والے جانور Rodents و دیگر جانور اور پیڑ پودے شامل ہیں۔ یہ تمام اپنی نشوونما کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور اس کاوش میں کبھی کبھی مرض کا سبب بنتے ہیں۔ بعض اوقات یہ ذخیرۂ تعدیہ یا پیغام رساں کے طور پر بھی امراض کو پھیلانے میں معاون ہوتے ہیں۔ اس ماحولیاتی نظام میں تمام جاندار ایک دوسرے کے ساتھ adjust کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اگر یہ نظام طبعی حالت میں قائم رہے تو زیادہ تر یہ صحت کا سبب ہوتا ہے حالانکہ ہمیشہ ایسا ہونا ضروری نہیں اور اگر کسی وجہ سے یہ نظام بگڑ جائے تو امراض پیدا ہوتے ہیں تحفظی طب کی بدولت حیاتیاتی اسباب کو بہت حد تک کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔

نفسیاتی سماجی ماحول (Psychosocial Environment)

یہ وہ اسباب ہیں جو انسان کی سماجی زندگی اور اس کی نفسیات سے تعلق رکھتے ہیں جن کی وجہ سے انسان کی صحت کے انتظامات اور سماجی صحت متاثر ہوتی ہے۔ اس میں تہذیب وتمدّن، عادات، مذہب، تعلیم، طرز زندگی، سماجی حیثیت، ذرائع صحت، سیاسی تنظیمیں وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ہر انسان اپنے آس پاس بہت سے انسانوں سے گھرا ہوا ہے۔ ہر انسان سماج، اہل وعیال، ذات برادری، عوام اور ایک ملک کا حصہ ہوتا ہے ان تمام لوگوں کے مابین اختلافات وغیرہ ہو سکتے ہیں جن کی وجہ سے اکثر لڑائی جھگڑے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک انسان کا مزاج واخلاق اس سے متعلقہ بقیہ افراد پر اثر انداز ہوتا ہے اور دل شکنی کا سبب ہو سکتا ہے۔ ملک کے قوانین اور رواج وغیرہ تمام لوگوں کے مابین تعلقات پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان اثرات کے نتائج مثبت بھی ہو سکتے ہیں اور منفی بھی۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو صحت وزندگی بہتر ہوتی ہے یا پھر خراب نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ چنانچہ ایسے قوانین اور رواج جو صحت کے لیے مفید ہوں ان کی حفاظت کرنی چاہیے اور ان پر قائم رہنا چاہیے۔

انسان کی اپنی نفسیات بھی اس کی صحت میں اہم رول ادا کرتی ہے مثلاً غربت، ہجرت، غم وفکر، معاش کا نہ ہونا، اولاد کی معذوری وغیرہ سے غم، غصہ، فکر وغیرہ پیدا ہوتا ہے جو اکثر صداع اور اختلاج اور تعریق کا باعث بنتا ہے۔ اور کچھ مدت کے بعد قرحہ معدی واثنا عشری، دمہ، ضغط الدم قوی اور دماغی امراض وغیرہ کا سبب ثابت ہوتا ہے۔

(ماخوذ: حفظان صحت، سنہ اشاعت 2018، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی)

حسن کی نگہداشت

الائچی کے ماسک کے فائدے

خوشبودار الائچی نہ صرف ٹھنڈی ہوتی ہے بلکہ کھانوں میں بھی خوب ذائقہ بڑھاتی ہے۔ الائچی کے فائدے تو آپ جانتی ہی ہوں گی مگر اس کا فیس پیک آپ نے شاید ہی استعمال کیا ہوگا۔ الائچی میں پوٹاشیم، کیلشیم، آئرن، میگنیشیم اور فاسفورس پایا جاتا ہے جو اس کو نہ صرف صحت بلکہ جلد کے لیے بھی مفید بناتا ہے۔

ٹپ: چار الائچیوں کو پیس کر آپ اس کا پاؤڈر بنا لیں اور اس کو ایک پیالی میں رکھ لیں۔

اب اس میں چار چمچ ٹھنڈا دودھ اور ایک لیموں کا رس ڈال کر اچھی طرح مکس کریں اور کچھ دیر کے لیے چھوڑ دیں۔

اب اس فیس پیک کو چہرے پر لگائیں اور خشک ہونے دیں۔

اگر آپ کے چہرے پر دانے ہوں تو اس کو رگڑیں نہیں۔

خشک ہو کر یہ جھڑنے لگے تو سادے پانی سے چہرہ دھو لیں۔

یہ آپ کو تازگی بھی پہنچائے گا اور گرمی میں جلد کے آئل کو کنٹرول کرنے میں آپ کی مدد بھی کرے گا۔

پھٹی ایڑیوں کو صحیح کرنے کا طریقہ

ٹوتھ پیسٹ میں لیموں ڈالیں اور بتائے گئے طریقے سے استعمال کریں اتنا فائدہ ہوگا کہ اس نسخے کا استعمال یقینی بنا لیں گی۔

خواتین اپنی بہت حفاظت کرتی ہیں لیکن پیروں کی

ایڑیوں کی بات آئے تو وہ انھیں چھپاتی گھومتی ہیں کیونکہ پھٹی ایڑیاں آخر پسند ہی کس کو ہیں۔ لہٰذا آج استعمال کریں یہ عام سا ٹوتھ پیسٹ اور بنائیں اپنی ایڑیاں نرم ملائم نازک!

طریقہ:

☆ ایک چھوٹی پیالی میں ایک چمچ کولگیٹ ٹوتھ پیسٹ لیں، ایک لیموں کا رس، ایک چمچ ناریل کا تیل اس میں ایک وٹامن ای کا کیپسول کھول کر اس کا آمیزہ ڈال کر اچھی طرح مکس کر لیں۔

☆ اب اس پیسٹ کو اپنی ایڑیوں پر لگائیں، اس کا روزانہ استعمال آپ کی ایڑیوں کو پہلے کی طرح حسین اور نرم و ملائم بنا دے گا۔

گنج پن کا علاج

گنج پن سے بچنا چاہتے ہیں تو ان 5 غذاؤں کا استعمال لازمی کریں۔

بالوں کی خوبصورتی تو ہم سب کو پسند ہوتی ہے کیونکہ کہا جاتا ہے کہ بال ہی عورت کی اصل خوبصورتی ہیں اور اس کے لیے ہر قسم کے نسخے، ٹوٹکے، دوائیں یہاں تک کہ سر کے اندر انجیکشن تک لگوا لیتی ہیں مگر پھر بھی بالوں کے معاملے میں مطمئن نہیں ہو پاتی ہیں۔ جو کہ ایک بڑی پریشانی ہے اور اسی وجہ سے کہیں نہ کہیں ہم گنج پن کی طرف چلے جاتے ہیں اور بال یوں تیزی سے گرتے ہیں کہ گنج پن آ جاتا ہے۔

گنج پن کی کئی وجوہات ہوتی ہیں کچھ لوگوں کی جینز میں ہی یہ مسئلہ ہوتا ہے اور کہیں ہارمونل افیکٹ کی وجہ سے یہ مسئلہ بڑھ جاتا ہے۔ مگر گنج پن کو ختم کرنے کے لیے اگر آپ کو جسم میں کسی چیز کی موجودگی کی ضرورت ہے تو یہ جز کیروٹین ہے جس کے ساتھ لیوٹین اور زیا ژنتی کا ہونا بھی لازمی ہے اور اگر یہ وٹامن ہمارے جسم میں یا سر کے خلیات میں شامل نہ ہوں تو ہمارے بالوں کی نہ تو جڑیں مضبوط ہو سکتی ہیں اور نہ ہی ہم گنج پن سے نجات حاصل کر سکتے ہیں۔

یہاں ہم آپ کو روزمرہ کے استعمال کی وہ عام غذائیں بتا رہے ہیں جو آپ کو گنج پن کنٹرول کرنے اور بالوں کی نشوونما میں قدرتی طور پر اضافہ کرنے میں مدد دے سکتی ہیں:

گرین ٹی:

گرین ٹی میں Epigalloconchin Gallate نامی جز پایا جاتا ہے جو کہ بالوں کی حفاظت کے لیے بہت مفید ہوتا ہے۔ اس سے بالوں کی نشوونما بڑھتی ہے اور بالوں کے جھڑنے کو کنٹرول کرتی ہے۔

ناریل کا تیل:

یہ عام طور پر خوبصورتی، جلد کی دیکھ بھال، بالوں کی دیکھ بھال، اور مجموعی صحت کے لیے مفید ہے۔ اس میں ٹرائلیسیر ائڈس (ایم سی ٹی)، لورک ایسڈ پایا جاتا ہے جو بالوں کو گرنے سے بچانے اور گنج پن کو کنٹرول کرنے میں مدد دیتا ہے۔

پیاز:

پیاز میں کویرٹین نامی انزائمز، الفا/5 ریڈکٹیس اور آکسیڈیٹیو پائے جاتے ہیں جو بالوں کو جھڑنے سے روکنے میں مدد دیتے ہیں۔

ہلدی:

ہلدی میں ایسے متحرک مرکبات پائے جاتے ہیں جو کر کومینوائڈز کہلاتے ہیں جو صحت کے ساتھ ساتھ بالوں کو بڑھانے میں آپ کی خاصی مدد کر سکتے ہیں مگر اعتدال سے استعمال کرنا مفید ہے۔

کدو کے بیج:

کدو میں آئرن، زنک، میگنیشیم، الفا-5 ریڈکٹیس اور اینٹی آکسیڈینٹ ہوتے ہیں جو بالوں کی نشوونما کو فروغ دیتے ہیں۔

(بحوالہ: www.kfoods.com)

□□□

تاثرات: نگر نگر سے

اکتوبر کا 'خواتین دنیا' نظر سے گزرا۔ پچھلے شماروں کی طرح یہ شمارہ بھی لاجواب ہے۔ اکتوبر کا اداریہ نئی تعلیمی پالیسی پر مبنی ہے۔ مرکزی حکومت نے اسکولی اور اعلیٰ تعلیمی سطح پر تعلیمی نظام میں کچھ تبدیلیاں کی ہیں۔ اس تعلیمی پالیسی میں سب سے اہم اور خاص بات یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم بچے اپنی مادری زبان میں حاصل کرسکیں گے جبکہ اردو یا کسی دوسری زبان سے محبت کرنے والے اپنے بچوں کو اپنی مادری زبان میں تعلیم دلا سکتے ہیں۔ اس تعلیمی نظام میں اردو اکیڈمیوں کے قیام کی بات بھی کی گئی ہے۔ جن ریاستوں میں اردو اکیڈمیاں نہیں ہیں وہاں ان کے قیام کو عملی جامہ پہنایا جائے گا۔

مذکورہ تعلیمی پالیسی میں تمام زبانوں کے فروغ کی بات کی گئی ہے۔ خواتین کے تعلیمی معیار کو بھی تبدیل کیا جائے گا اور ساتھ ہی ٹیچر کی تقرری بھی ایک مقررہ مدت میں عمل میں لائی جاسکے گی۔ پسماندہ طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کو مالی امداد بھی فراہم کی جائے گی۔ غرض ہر اعتبار سے نئی تعلیمی پالیسی ہم سب کے لیے مفید ثابت ہوگی اس کی ہم بھی کو امید کرنی چاہیے۔

شخصیت کے ذیل میں راشد میاں کا مضمون اعلیٰ اور معیاری ہے۔ اردو ادب کے شعری سرمائے میں خواتین کی تخلیقات کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ نثر ہو یا شاعری خواتین نے ہر میدان میں اپنی شمولیت درج کرائی ہے خصوصاً ادب کے میدان میں۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی تحریروں کو وہ مقبولیت نہ مل سکی جس کی وہ حقدار تھیں۔ راشد میاں نے صالحہ بیگم پروین پر مضمون لکھ کر ہمارے علم میں اضافہ کیا ہے اور ہمیں یہ باور کرایا ہے کہ راجستھان کی اولین صاحب دیوان شاعرہ صالحہ بیگم پروین ہیں۔ مصنف نے ان کے بارے میں خود اعتراف کیا ہے کہ ''پروین قادرالکلام شاعرہ ہونے کے علاوہ بہترین نثر نگار اور مترجم بھی تھیں۔''

اس کے علاوہ شمارے میں سات مضامین اور تین افسانے شامل کیے گئے ہیں جو مختلف موضوعات پر مبنی ہیں۔ آسیہ رئیس خان کی کہانی 'خاکی چھتری' بہت پسند آئی۔ حسن سخن، باورچی خانہ، صحت، آرائش و زیبائش، تاثرات اور خواتین خبرنامہ بھی لائق توجہ ہیں۔

'خواتین دنیا' کی انفرادیت یہ ہے کہ یہ نسائی جذبات و احساسات کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔ یہ خواتین کی ذہنی طور پر تربیت کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے تاکہ وہ اپنے جذبات کا اظہار اپنی تحریروں کے ذریعے کرسکیں۔ رسالے کی کامیابی کے لیے دعاگو ہوں۔

مینال فاطمہ، بھیونڈی، مہاراشٹر

گوا کی روبیہ شیخ نے نیٹ میں نمایاں کامیابی حاصل کی

واسکو شہر کی اس ہونہار طالبہ نے نیٹ 2020 میں 720 میں سے 675 نمبرات حاصل کیے ہیں۔

روبیہ شیخ نے نیٹ 2020 میں 720 میں سے 675 نمبرات لے کر گوا کی ٹاپر بننے کا اعزاز حاصل کیا ہے۔ واسکو شہر کے نواحی علاقے کی رہنے والی روبیہ کو قومی سطح پر 922واں مقام حاصل ہوا ہے۔ اس سے قبل میڈیکل انٹرنس امتحان میں ریاست کے کسی بھی طالب علم کو اتنے زیادہ مارکس حاصل نہیں ہوئے تھے۔ روبیہ کے والد شیخ عبدالسلام نے انقلاب سے گفتگو کے دوران بتایا کہ روبیہ بچپن سے بلا کی ذہین اور محنتی ہے۔ کلاس میں ہمیشہ اول نمبر سے کامیاب ہوئی۔ شیخ عبدالسلام مورگاؤن پورٹ ٹرسٹ میں بطور انجینئر برسر روزگار ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ روبیہ سائنس اور میتھس اولمپیاڈ کے علاوہ اسکولی سطح پر منعقد تمام مسابقتی امتحانات میں شرکت کر چکی ہے۔ نیشنل ٹیلنٹ سرچ امتحان میں روبیہ نے 200 میں سے 156 مارکس حاصل کیے تھے۔ اتنا ہی نہیں روبیہ نے کے وی پی وائی امتحان میں بھی کامیابی حاصل کی ہے۔

ان سے پوچھے گئے اس سوال پر کہ والدین اپنے بچے کو میڈیکل امتحان نیٹ کی تیاری کرانا چاہیں تو انھیں کن باتوں پر توجہ دینی چاہیے؟ انھوں نے کہا کہ والدین سب سے پہلے یہ بات ملحوظ رکھیں کہ اسکولی سطح پر ان کے بچے میں فزکس کیمسٹری، بایولوجی اور میتھس مضمون کی دلچسپی ہے یا نہیں؟ اگر ہے تو ٹھیک ورنہ آسانی کے ساتھ بغیر دباؤ ڈالیں ان مضامین کی دلچسپی اور گھر میں ماحول پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ نویں اور دسویں کی نصابی کتابوں کا اچھی طرح مطالعہ کرنے کی ترغیب دیں۔ بچے میں جیسے جیسے سائنس مضمون کی دلچسپی بڑھے گی سائنس اور میتھس مضمون آسان ہوتا جائے گا۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا جب میری سائنس اور میتھس مضمون کی دلچسپی بڑھی میرے والدین نے مجھے نویں اور دسویں جماعت میں فاؤنڈیشن کورس جوائن کروایا۔ جس کا مجھے این ٹی ایس اور کے وی پی وائی میں خاطر خواہ فائدہ ہوا۔ میں ایک بات والدین سے یہ کہنا چاہوں گی کہ تمام بچوں کو فاؤنڈیشن کورس جوائن کروانے کی ضرورت نہیں کچھ بچے ذہین ہوتے ہیں جبکہ کچھ بچوں کی ذہنی استعداد اس قابل نہیں ہوتی کے ان سے زبردستی یہ کام کروایا جائے۔ کچھ والدین نویں اور دسویں جماعت کی پڑھائی کے علاوہ اپنے بچوں پر ڈاکٹر اور انجینئر بنانے کے لیے گیارہویں اور بارہویں کی پڑھائی کا بھی بوجھ ڈال دیتے ہیں اس کی ضرورت بالکل نہیں۔ والدین بچے کی ذہانت، دلچسپی، شخصیت، قابلیت اور ذہنی استعداد کے مطابق اس کے اندر پڑھائی کی اتنی دلچسپی پیدا کر دے کہ وہ مطالعہ کے شوقین ہو جائیں۔ (انقلاب ڈاٹ کام، 20 اکتوبر 2020)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات

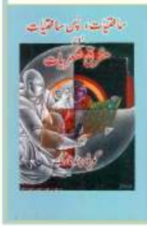

مصنف: گوپی چند نارنگ

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 620

قیمت: 275 روپے

ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں

مصنف: گوپی چند نارنگ

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 364

قیمت: 175 روپے

بابرنامہ

مصنف: ظہیر الدین محمد بابر

چھٹی طباعت: 2020

صفحات: 101

قیمت: 25 روپے

کلیم عاجز

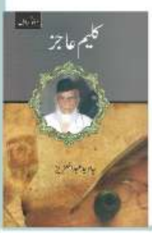

مصنف: جاوید عبدالعزیز

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 124

قیمت: 80 روپے

جزیرہ نہیں ہوں میں

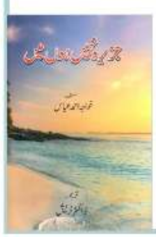

مصنف: خواجہ احمد عباس

ترجمہ: ڈاکٹر نریش

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 669، قیمت: 300 روپے

رامپور کے فارسی گو شعرا

مولفہ: ساجدہ شیروانی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 290

قیمت: 160 روپے

انیس (سوانح)

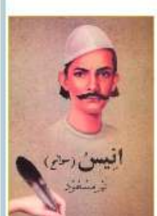

مصنف: نیر مسعود

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 427

قیمت: 220 روپے

صحت الفاظ

مصنف: سید بدرالحسن

ساتویں طباعت: 2019

صفحات: 253

قیمت: 90 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Mahnama Khawateen Duniya Monthly December 2020, Vol. 4, Issue:12 RNI. No. DELURD/2017/74026
ISSN 2581-4826
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025